# فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۱۲۴

جولائی ۱۹۷۹ء تا دسمبر ۱۹۷۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

| شمار | اسمائے گرامی | صفحہ | شمار | اسمائے گرامی | صفحہ |
| --- | --- | --- | --- | --- | --- |
| ۱ | جناب اخلاق حسین دہلوی، بستی نظام الدین، دہلی، | ۸۵ - ۱۶۹<br>۲۴۵ - ۳۴۶ | ۷ | سید صباح الدین عبدالرحمٰن | ۲۲ - ۵۹<br>۸۲ - ۱۰۹<br>۱۴۶ - ۱۶۲<br>۱۸۵ - ۲۴۲<br>۲۷۹ - ۳۲۳<br>۴۰۲ |
| ۲ | بیگم اختشام ندوی ضیار | ۴۶۴ | | | |
| ۳ | جناب اطہر ریحان فلاحی طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ | ۴۳۶ | ۸ | ضیاء الدین اصلاحی سہریادی | ۷۸ - ۱۵۷<br>۲۳۵ - ۳۱۵<br>۳۹۱ ۳۹۸<br>۴۷۲ |
| ۴ | مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا ایک مکتوب | ۷۴ | ۹ | عبدالسلام قدوائی ندوی | ۶۸ |
| ۵ | جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے، ایل ایل بی، ریسرچ فیلو انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ علی گڑھ | ۵ - ۳۶۱<br>۴۱۹ - | ۱۰ | ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی پروفیسر ملک عبدالعزیز یونیورسٹی مکہ | ۳۸۷ |
| | | | ۱۱ | پروفیسر خواجہ مجیب الحق ایم اے باراسات گورنمنٹ کالج مغربی بنگال | ۴۶۵ |
| ۶ | جناب سید شہاب الدین دسنوی | ۵۱ | | | |

| شمار | اسمائے گرامی | صفحہ | شمار | اسمائے گرامی | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱۲ | حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دارالمصنفین | ۳۰۴-۳۷۸ | ۱۵ | محمد منصور نعمانی بھوپالی ندوی رفیق دارالمصنفین | ۳۵<br>۴۵۷ |
| ۱۳ | جناب محمود الرحمن صاحب کراچی | ۴۵۰ | ۱۶ | ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ | ۱۳۳-۱۹۸<br>۳۲۵-۴۰۵ |
| ۱۴ | ڈاکٹر محمد معز الدین ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی پاکستان | ۴۶۳ | | | |

## شعراء

| شمار | اسمائے گرامی | صفحہ | شمار | اسمائے گرامی | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | جناب بسنت کمار بسنت ایڈوکیٹ لکھنؤ | ۳۱۴ | ۲ | جناب علی جواد زیدی صاحب علی گڑھ | ۲۳۴ |



# فہرست مضامین معارف

جلد ۱۲۴

جولائی ۱۹۷۹ء تا دسمبر ۱۹۷۹ء

(بترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۲۴ ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۷۹ء عدد ۱

## مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# شذرات

پچھلے دنوں ہمارے کتب خانہ میں چند بہت مُفید اور اہم کتابوں کا اضافہ ہوا، ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر امام عبدالرزاق کی مُصنّف کی گیارہ جلدیں ہیں، جو حافظ ذہبی اور علامہ ابن حجر کے قول کے مطابق علم کا خزانہ ہیں،

امام عبدالرزاق سر برآوردہ تبع تابعین میں ہیں، ممتاز محدثین نے اُن کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا ہو اور امام بخاری، امام مسلم اور صحاح کے مصنفوں کے استاد کے استاد تھے، اُن کی مصنف محدثین کے لئے مرجع اور ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اپنی اہمیت کے باوجود اب تک طباعت سے محروم تھی، مولانا انور شاہ کشمیریؒ اپنے شاگردوں کو اس کی طباعت کی طرف برابر توجہ دلاتے رہتے، اللہ تبارک تعالیٰ نے اُن ہی کے شاگردوں کو اس کی توفیق عطا فرمائی، گجرات کے مولانا محمد میاں سملکی اور اُن کے فرزند ارجمند مولانا ابراہیم میاں سملکی نے اس کی طباعت کے مصارف برداشت کرنے کی آمادگی ظاہر کی، تو مئو ضلع اعظم گڈھ بلکہ اس برصغیر کے مایہ ناز عالم مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے اس کی ترتیب و تصحیح کی پوری ذمہ داری لی، انھوں نے مختلف کتب خانوں سے اس کے قلمی نسخے فراہم کرائے، بڑی احتیاط سے ان کا مقابلہ کرکے ان پر حواشی لکھے، اور پھر اس پر ایک فاضلانہ مقدمہ قلمبند کیا، جس سے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا، ان معنوی خوبیوں کے ساتھ مولوی ابراہیم میاں سملکی کی دریا دلی اور نفاست پسندی کی وجہ سے اس عروس جمیلہ کے لئے لباس حریر بھی فراہم کیا گیا، جس سے کتاب حسن طباعت کا بھی شاہکار ہو گئی،

اس پر مولانا حبیب الرحمن اعظمی کا جو عالمانہ مقدمہ ہے، وہ نظر کی وسعت، فکر کی گہرائی، اور تلاش و تجسس کی نادر مثال ہے، اس لئے اس کو ایک علٰحدہ کتاب کی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے،

امید ہے کہ اس کی اشاعت سے اسلامی ممالک میں نہ صرف مولانائے محترم بلکہ ہندوستان کے علماء



کا بھی وقار اور وزن قائم ہوگا، مصنف کی جلدیں مجلس علمی ڈابھیل ضلع سورت سے مل سکتی ہیں

دوسری قابل ذکر کتاب علامہ شوکانی کی تفسیر فتح القدیر ہے، تفسیر کی کتابوں میں عموماً روایات کی تحقیق و تنقید کا رواج نہیں ہے لیکن علامہ شوکانی صاحب نظر محقق تھے، وہ رجال کے حالات سے باخبر اور روایات کے اسقام سے اچھی طرح واقف تھے، اس لئے انھوں نے بڑی چھان بین سے کام لے کر ضعیف روایتوں کے ضعف کو نمایاں کیا ہے، یہ کتاب عرصہ ہوا کہ شائع ہوئی تھی لیکن مدت سے کمیاب تھی، دار الفکر بیروت نے پانچ جلدوں میں شائع کرکے اہل علم پر احسان کیا ہے،

فتح العلام حافظ ابن حجر کی مشہور کتاب بلوغ المرام کی شرح سبل السلام کی تلخیص ہے، نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے بڑے صاحبزادے نواب نور الحسن مرحوم نے طلبہ اور مدرسین کی سہولت کی غرض سے اس طویل شرح کو ۲ دو جلدوں میں مختصر کر دیا جن کو موسستہ دار الکتب الثقافیہ کویت نے اب شائع کیا ہے، یہ بھی ہمارے کتب خانہ کو بھیجی گئی ہے، امید کہ طالب علموں اور مدرسوں کے علاوہ عام اہل علم بھی اس سے مستفید ہوں گے،

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے ایک مفید کتاب مآثر جہانگیری بھی موصول ہوئی جہانگیر کے دور کا اہم ترین ماخذ تو خود اس شہنشاہ کی خود نوشت سوانح عمری تزک جہانگیری ہے، دوسرا اہم ماخذ معتمد خاں کی اقبالنامہ جہانگیری ہے، تیسرا ماخذ مآثر جہانگیری ہے، پہلی دو کتابیں تو چھپ چکی تھیں، یہ تیسری کتاب اب تک قلمی نسخہ کی حیثیت سے مختلف کتب خانوں میں پڑی تھی، خوشی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کی لکچرر عذرا علوی صاحبہ نے اس کے مختلف نسخے جمع کئے اور محنت سے ایڈٹ کرکے اس دور سے دلچسپی رکھنے والوں کے ہاتھوں تک پہنچا دیا، اس میں انھوں نے انگریزی میں جو تمہیدی ابواب لکھے ہیں، اور اس کے متن کے نیچے جابجا جن حواشی کا اضافہ کیا ہے اس سے ان کی خوش سلیقگی کا اظہار ہوتا ہے،

اس کتاب کا مصنف خواجہ کامگار حسینی ہے، جو جہانگیر اور شاہ جہان کے دربار کا ایک امیر تھا، اترپردیش کے شہر شاہ جہان آباد کو اُسی نے اپنے شاہی آقا کے نام سے آباد کیا، اس تاریخ میں زیادہ تر وہی واقعات ہیں جو تزک جہانگیری اور اقبال نامۂ جہانگیری میں ہیں، مگر بعض امرأ کی سرگرمیوں سے متعلق کارآمد معلومات ہیں، اس کی اشاعت ایک مفید علمی خدمت ہے،

---

جناب مشفق خواجہ صاحب پاکستان کے جوان سال، جوان حوصلہ بلکہ ایک جواں مرد اہل علم اور ادیب ہیں، اُن کی ایک کتاب جائزۂ مخطوطاتِ اُردو کی پہلی جلد ابھی موصول ہوئی ہے، جو ۱۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں بظاہر کراچی کے مختلف کتب خانوں کے دو سو اردو کے قلمی نسخوں کا ذکر ہے، مگر اُن کی توضیحی، ادبی اور کتابیاتی تفصیلات لکھنے میں اس برصغیر کے تقریباً ایک ہزار اور مخطوطات کا بھی ذکر آگیا ہے، دواوین کے سلسلہ میں شعراء کے سوانحی حالات اور اُن کے کلام کے نمونے بھی ہیں، جن سے اس میں تذکرہ کا رنگ پیدا ہوگیا ہے، اس طرح روایتی فہرست سازی سے الگ اس کا اپنا ایک علٰحدہ آرٹ بن گیا ہے، جس محنت اور تحقیق سے اس میں گوناگوں معلومات فراہم کی گئی ہیں، اس بنا پر اس کے لائق مرتب کو کارل بروکلمان اور سی۔ اے۔ اسٹوری کیا، بلکہ ابن ندیم اور حاجی خلیفہ سے بھی اونچا درجہ دیا جائے تو صحیح ہوگا،

---

ابھی اس کی اور بھی جلدیں شائع ہونے والی ہیں، اُن کی اشاعت کے بعد مشفق خواجہ صاحب اردو کے بقائے دوام کے دربار میں ضرور نمایاں جگہ حاصل کریں گے، یہ کتاب نہ صرف ہر کتب خانہ کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہوگی، بلکہ عام قارئین بھی اس کو پڑھنا شروع کریں گے، تو اس کو قلمی کتابوں کی ایک فہرست کے بجائے ایک دلچسپ، پُر مغز، اور پُر از معلومات ادبی تصنیف پائیں گے، یہ مرکزی بورڈ، پوسٹ بکس ۱۳۱۰، گلبرگ لاہور سے مل سکتی ہے،

---



# مقالات

## قاضی زادہ رومی مصنف شرح چغمینی

## احوال و آثار

(۳)

از، جناب شبیر احمد خان غوری ایم۔ اے۔ ایل ایل بی ریسرچ فیلو انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ علیگڈھ

**مدرسۂ الغ بیگ کی صدارت**

۸۲۳ھ میں شاہرخ نے ولیعہد سلطنت مرزا الغ بیگ کو ماوراء النہر کی بالاستقلال ایالت بخشی شاہزادہ سمرقند پہونچا، جہاں تدبیر ملک وانتظام سلطنت کے علاوہ اس نے ایک مدرسہ قائم کیا۔ صاحب "حبیب السیر" نے لکھا ہے:۔

"ودر ۸۲۳ھ بایالت ولایت ماوراء النہر سرافراز گشت وبیمن معدلت و رعیت پروری باندک زمانے آن مملکت را در معموری بمرتبۂ رسانید کہ برتبت از سپہر بریں درگزشت۔ وآں خسرو بے مانند در وسط بلدۂ فاخرۂ سمرقند مدرسۂ رفیع وخانقاہ بنیع بنا فرمودہ باتمام رسانید وبسیارے از مزارع وقری ومستغلات فوائد انتماء بر اں بقاع نفاع وقف گردانید"[۱]

---

[۱] حبیب السیر صفحہ ۱۵۱۔

اسی طرح عبد الرزاق کاشی جس نے اس مدرسہ اور دوسری عمارتوں کو بچشم خود دیکھا تھا "مطلع السعدین" میں لکھتا ہے،

"و درون شہر سمرقند . . . . . مدرسہ و خانقاہے برابر یکدگر بنا فرمود و چند سال در اتمام آں و در مقام اہتمام تمام بذل نمود . . . . . و شاہزادہ کیوان وقار مشتری آثار مستغلات بسیار و مزارع و انبار بران بقاع وقف فرمود و اعلام علماء و نحاریر فضلاء بتدریس و افادت در مدرسہ تعیین فرمود . . . . . و حاوی اوراق عبد الرزاق بحسن اتفاق چندگاہ کہ در دار السلطنت سمرقند مقیم بود، احوال برائے العین مشاہدہ نمود"[1]

اسی طرح حسن روملو نے "احسن التواریخ" کے اندر ۸۲۴ھ کے واقعات کے ضمن میں لکھا ہے:-

"دریں سال مرزا الغ بیگ در وسط شہر سمرقند مدرسہ عالی بنا نہاد و ملک بسیار بروے وقف کردہ"[2]

یہ مدرسہ مربع شکل کا تھا جس میں چاروں طرف بے شمار حجرے بنے ہوئے تھے' ان حجروں میں طلبہ کا قیام رہتا تھا، عمارت کے ہر ضلعے میں تعلیم و تدریس کے لیے ایک درسگاہ تھی جس کیلئے شاہزادے نے ایک مدرس کا تقرر کیا تھا، اور ان تمام مدرسین کا افسر اعلیٰ قاضی زادہ کو مقرر کیا تھا[3]، دولت شاہ نے بھی اس مدرسہ کو دیکھا تھا، وہ اس کے بارے میں لکھتا ہے:-

"در خطہ سمرقند مدرسہ عالی بنا فرمودہ کہ در اقالیم برتبت و قدر آں مدرسہ نشان نمی دہند، و اکنوں دراں مدرسہ عالی زیادہ از صد نفر طالب علم متوطن و موظف اند"[4]

[1] مطلع السعدین ص ۲۳۶ [2] احسن التواریخ ص ۱۳۰ [3] الشقائق، ص ۱۸ [4] تذکرہ دولت شاہ ص ۲۶۶



تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ چاروں مدرسین اپنے شاگردوں سمیت پہلے قاضی زادہ کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ درس سے فارغ ہو کر قاضی زادہ تو اپنے مکان تشریف لے جاتے، اور مدرسین اپنی اپنی درسگاہوں میں جا کر طلبہ کو تعلیم دیتے۔[1]

اکثر شاہزادہ خود مدرسہ کے معائنہ کے لیے آیا کرتا، اور قاضی زادہ کے درس میں شریک ہوتا، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ شہزادہ کسی مدرس سے ناراض ہوگیا، اور اسے مدرسی سے برخاست کر دیا، قاضی زادہ کو معلوم ہوا تو وہ بھی گھر بیٹھ رہے، ایک دن شاہزادہ حسب دستور مدرسہ کے معائنہ کے لئے آیا۔ جب قاضی زادہ کو وہاں نہ دیکھا تو سمجھا شاید طبیعت ناساز ہے، اسی لیے نہیں آئے ہیں، اس لیے عیادت کے لیے اُن کے گھر پہونچا، وہاں انھیں صحیح اور تندرست پایا، لہذا اُن سے اتنے دن مدرسہ نہ آنے کا سبب دریافت کیا۔ قاضی زادہ نے فرمایا کہ میں ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، انھوں نے مجھے نصیحت کی تھی کہ صرف وہی ملازمت اختیار کروں، جہاں برخاست ہونے کا کھٹکا نہ لگا رہے، میرا خیال تھا تدریسی خدمت ہی ایک ایسی ملازمت ہے لیکن

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

معلوم ہوا مدرسین بھی برخاست کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے میں اس ملازمت کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا، شاہزادے نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اور اس کے لیے معذرت کی۔ پھر برخاست شدہ مدرس کو اُس کی ملازمت پر بحال کیا، اور آیندہ کے لیے وعدہ کیا کہ کسی مدرس کو برخاست نہیں کرونگا، اس کے بعد اُن سے دوبارہ مدرسہ کی صدارت کا عہدہ سنبھالنے کی درخواست کی، بڑی منت و سماجت کے بعد قاضی زادہ دوبارہ مدرسہ کی

[1] الشقائق صفحہ ۱۹

صدارت کے لیے تیار ہوئے۔[۱]

اس واقعہ سے اُن کی عزت نفس، حفظ مراتب، حق گوئی اور ماتحتوں کے ساتھ شفقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

**رصدگاہ کی تولیت** مدرسہ کے ساتھ ہی الغ بیگ نے ایک رصدگاہ بھی تعمیر کرائی تھی۔ الغ بیگ کی قائم کردہ رصدگاہ، رصدگاہوں کے اس سلسلے کی آخری اہم بالشان کڑی تھی، جس کا آغاز عباسی خلیفہ المامون نے ۲۱۴ھ میں کیا تھا، رصدگاہ مامونی سے پہلے بھی عہد اسلام میں ایک رصدگاہ کا پتہ چلتا ہے، جو مامون کے باپ ہارون الرشید کے عہد خلافت میں شہر جندی سابور کے اندر محمد بن احمد النہاوندی کی سربراہی میں ارصادی سرگرمیوں میں مصروف تھی[۲] لیکن سرکاری سرپرستی میں قائم ہونے والی پہلی رصدگاہ مامون ہی کی قائم کردہ تھی جو اس نے بغداد اور دمشق میں قائم کی۔[۳]

رصدگاہ مامونی کے بعد بھی بے شمار رصدگاہیں قائم ہوئیں۔ ایک ترک محقق نے عہد اسلام کی صرف اُن رصدگاہوں کی تعداد جو ۸۰۰ھ اور ۱۰۵۰ھ کے مابین قائم ہوئیں، اور جن کی ارصادی دریافتوں کی تفصیل ہنوز قابل رسائی مخطوطات میں موجود ہے، ۱۰۴ بتائی ہے۔[۴] مگر ان میں اکثریت ان رصدگاہوں کی تھی، جو سرکاری سرپرستی سے آزاد ہو کر قائم کی گئیں، ان میں سب سے اہم البتانی اور ابوریحان البیرونی کی ارصادی سرگرمیاں تھیں۔

سرکاری سرپرستی میں قائم ہونے والی دوسری اہم رصدگاہ بھی بغداد ہی میں تعمیر ہوئی

---

۱؎ الحقائق صفحہ ۱۵ ۲؎ الزیج الکبیر الحاکمی لابن یونس ص ۱۰۱ ۳؎ طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص ۵۰ ۴؎ Cambridge History of Iran - Vol V, P.672



اسے عضد الدولہ بویہی کے بیٹے شرف الدولہ نے ۳۷۸ھ میں قائم کرایا تھا، چنانچہ امام ذہبی نے "العبر فی خبر من غبر" میں ۳۷۸ھ کے واقعات میں لکھا ہے:۔

| | |
|---|---|
| امر الملک شرف الدولہ | بادشاہ شرف الدولہ نے مامون خلیفہ |
| برصد الکواکب کما فعل | کی طرح ارصاد کواکب کا حکم دیا اور |
| المامون وبنی ہیکلا بدار | دار السلطنت میں ایک عظیم عمارت |
| السلطنۃ"[۱] | (رصدگاہ) تعمیر کرائی۔ |

جن ہیئت دانوں کے نام اس رصدگاہ سے وابستہ ہیں، اُن میں ابو الوفاء البوزجانی، ابو حامد الصغانی اور ویجن بن رستم الکوہی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، مزید تفصیل ابن القفطی نے "تاریخ الحکماء" میں دی ہے۔[۲]

اس کے کچھ ہی دن بعد فاطمی خلیفہ العزیز باللہ کے حکم سے مصر میں ایک عظیم الشان رصدگاہ قائم کی گئی، جہاں ابن یونس نے فلکی مشاہدات کئے، اس کی ارصادی سرگرمیاں العزیز باللہ کے بیٹے الحاکم بامر اللہ کے عہد میں ختم ہوئیں، اور اُس نے اپنی ہیئتی دریافتوں کو "الزیج الکبیر الحاکمی" میں مدون کیا۔[۳]

اگلی صدی میں ملک شاہ سلجوقی نے تقویم کی اصلاح اور خراج کی وصولی کے لیے نوروز کے تعین کے لئے شہر اصفہان میں عمر خیام کی زیر نگرانی ایک رصدگاہ قائم کرائی (۴۶۷ھ)[۴] بین الاقوامی انداز پر دنیا کی سب سے پہلی رصدگاہ مراغہ کی تھی جسے ایلخانی تاجدار ہلاکو خاں کے ایما سے ۶۵۷ھ میں محقق طوسی نے تعمیر کرایا تھا، انھوں نے اقطاع عالم سے

---

۱؎ العبر فی خبر من غبر حالات ۳۷۸ھ ۲؎ تاریخ الحکماء، ابن القفطی ص ۳۵۱ - ۳۵۳ ۳؎ ص ۱۰۱ زیج کے کچھ ابواب ۱۸۰۴ء میں پیرس سے شائع ہوئے تھے مگر یہ مطبوعہ نسخے بھی کمیاب ہیں، خوش قسمتی سے ایک نسخہ دار المصنفین اعظم گڑھ میں موجود ہے۔ ۴؎ کامل ابن الاثیر الجزء العاشر ص ۳۴

بڑے بڑے باکمال ہیئت دانوں کو اس کی ارصادی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے مدعو کیا تھا، جیسے قطب الدین شیرازی، نجم الدین کاتبی، موئد الدین عرضی دمشقی، محی الدین مغربی، فخر الدین اخلاطی وغیرہم[1]،

دنیائے اسلام کی آخری مہتم بالشان رصد گاہ سمرقند کی تھی، جسے الغ بیگ نے ۸۲۴ھ میں قائم کیا تھا، گستاولی بان "تمدن عرب" میں لکھتا ہے،

"تیمور کے پوتے الغ بیگ کو بھی جو سمرقند کا بادشاہ تھا، اور جس کا زمانہ پندرہویں صدی عیسوی کا وسط ہے، علم ہیئت کا بے انتہا شوق تھا، اور اس نے بھی بہت سے علماء جمع کئے تھے، چونکہ یہ بادشاہ نہایت دولتمند تھا، اس نے ایسے کامل آلات رصد بنوائے جو اس وقت تک نہیں بنے تھے، کہتے ہیں کہ اس کا ربع دائرہ اتنا بڑا تھا کہ اس کا نصف قطر قسطنطنیہ کی ہیئت صوفیہ کی بلندی کے برابر تھا، الغ بیگ گویا مدرسہ بغداد کا اخیر شخص ہے، اس کی تحقیقات نے قدیم اور جدید کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا، اس میں اور کیپلر کے زمانہ میں کل ڈیڑھ صدی کا فاصلہ تھا۔"

جس تصنیف کو الغ بیگ نے ۱۴۳۷ء میں منتشر کیا اس سے ہمیں پورا اندازہ عربوں کے علم ہیئت کا پندرہویں صدی عیسوی کے نصف تک معلوم ہوتا ہے، اس کا پہلا حصہ فی الواقع کتاب ہیئت ہے، اس میں وقت کی تقسیمیں، تقویم اور عام اصول علم ہیئت درج ہیں، اس کے بعد عملی ہیئت سے بحث کی گئی ہے، اور کسوف و خسوف کے حسابات اور جدولوں کے بنانے اور استعمال کی ترکیبیں وغیرہ دکھائی گئی ہیں، ان جدولوں میں ستاروں کی فہرست، چاند، سورج اور

[1] حبیب السیر جلد سوم جزو اول ص ۶۱ - ۶۲



سیاروں کی حرکتیں اور تمام دنیا کے بڑے بڑے شہروں کے طول اور عرض بلد دیے ہوئے ہیں"[1]

لیکن زیادہ قابل اعتماد معلومات معاصر یا قریبی متاخر مورخین نے دی ہیں، چنانچہ حسن روملو نے "احسن التواریخ" (مکتوبہ ۹۸۰ھ محفوظ کتب خانہ ملی پیرس نمبر ۱۷۰۱، ۱۷۰۵، از روئے فہرست بلوشے) میں ۸۲۳ھ کے واقعات میں لکھا ہے:

"دریں سال مرزا الغ بیگ میل استنباط رصد و استخراج زیچ فرمود و در شمالی سمرقند مایل بہ مشرق مقام قابل و لائق تعیین فرمود. باخبار حکمائے نامدار طالع کہ آں کار را شاید مقرر شد و بنیاد براں چو اساس آں دولت پائدار و بنیاد آں قاعدہ سلطنت استوار و استحکام یافت. تاکید بنیان و تشیید ارکان چوں قواعد جبال تا موعد تسیر الجبال سیرا مامون از زوال و مصئون از اختلال آمد، و ہیئت افلاک تسعہ و اشکال دوائر تسعہ و درجات و دقائق و ثوانی تا عواشر افلاک و تدادیر کواکب سبعہ سیارہ و صور کواکب ثابتہ و ہیئت کرہ ارض و صور اقالیم با کوہہا و دریاہا و بیابانہا و آنچہ از توابع آں باشد بہ نقوش دلپذیر و رقوم بے نظیر در درون خانہ ہائے آں عمارت عالی بنیاد و رفیع نہاد کہ نمودار قصر مقرنس سبع شداد بود ثبت و تحریر افتاد۔

و تقویم آفتاب و سائر کواکب را رصد کردہ بر زیچ جدید ایلخانی کہ جناب حکمت مآب خواجہ نصیر الدین طوسی استخراج نمودہ بود، فوائد لطائف افزودہ و در تقویم آفتاب و کواکب دیگر تفاوت صریح ظاہر ساخت و حکمائے بزرگ دراں فہم نازک مدد و معاون او بودند

[1] تمدن عرب لی بان ص ۴۲۲

واوازہ آں امر خطیر در بلاد و امصار اشتہار و انتشار یافت و شاہزادہ بہ تصحیح آن زیج موفق گردید باتمام رسید و بہ زیج جدید سلطانی گورگانی موسوم شد"[1]

[لیکن "احسن التواریخ" کے مخطوطہ نور عثمانیہ استانبول میں یہ سنہ ۸۴۲ھ بتایا گیا ہے]

"حبیب السیر" سے بھی یہ سال ۸۲۳ھ ہی معلوم ہوتا ہے، چنانچہ اس میں لکھا ہے:-

"در ۸۱۲ھ بایالت ولایت ماوراء النہر سرافراز گشت . . . . . وآں خسرو بے مانند . . . . . فرمان داد کہ استادان کارداں در ظاہر آں بلدہ فردوس مانند (سمرقند) رصدے بنیاد نہادند"[2]

مگر اس رصد گاہ کی تعمیر کی تفصیلی کیفیت عبدالرزاق کاشی نے، جس نے بچشم خود اسے دیکھا تھا، "مطلع السعدین" میں دی ہے۔

"وبعد از تحصیل کمالات وتکمیل آلات استنباط رصد واستخراج زیج فرمود"[3]

باقی تفصیل وہی ہے جو اوپر "احسن التواریخ" سے منقول ہوئی، حسن روملو نے یہ تفصیل "مطلع السعدین" ہی سے نقل کی تھی، صرف عبدالرزاق کاشی نے اس کا نام "زیج سلطانی گورگانی" بتایا اور اتنا اضافہ کیا ہے،

"آں زیج تصحیح یافتہ بہ اتمام رسید و بزیج سلطانی گورگانی موسوم شد، ودرمیان اہل صناعۃ تنجیم و اصحاب تقادیم معمول ومتداول است"[4]

دولت شاہ بھی اس زیج کی تعریف میں رطب اللسان ہے، اور "تذکرۃ الشعراء" میں لکھتا ہے۔

"والیوم نزد حکماء آں زیج متداول ومعتبر است وبعضے آنرا بر زیج نصیری ایلخانی

---

[1] احسن التواریخ ص ۱۱۰ [2] حبیب السیر جلد سوم جزء سوم ص ۱۵۱ [3] مطلع السعدین ص ۲۳۰
[4] مطلع السعدین ص ۲۳۹



ترجیح می کنند"[1]

الغ بیگ کی وفات کے کوئی چھیالیس سال بعد جب بابر سمرقند آیا تو اس نے اس رصدگاہ کو دیکھا تھا، وہ لکھتا ہے:-

"یک عمارت عالی دیگر در دامنہ پشتہ کوہک رصد است کہ آلت زیج نوشتن است، سہ آشیانہ است، الغ بیگ مرزا باین رصد زیج گورگانی نوشتہ کہ حالا ایں زیج معمول است و بزیج دیگر عمل کم کنند۔ ایں پیش زیج ایلخانی معمول بود کہ خواجہ نصیر در زمان ہلاکو خاں مراغہ نیز رصد بستہ بود"[2]

اس رصد گاہ میں جو آلات استعمال کئے گئے تھے، اس وقت تک، بلکہ اس کے بعد عرصۂ دراز تک یورپ میں بھی نہ بنے تھے، ایک مورخ علم الہیئت آرتھر بیری نے بھی ان کی نفاست کا اعتراف کیا ہے،

رصد گاہ کی تعمیر کے بعد الغ بیگ نے سب سے پہلے غیاث الدین جمشید کاشی کو اس رصدگاہ کا منتظم اعلیٰ مقرر کیا، مگر وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے، ان کی وفات کے بعد رصد گاہ کی تولیت ہمارے رئیس التذکرہ کو تفویض کی گئی، مگر رصد کے کام سے قبل ہی وہ بھی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے، اور رصد گاہ کی سربراہی مولانا علاء الدین علی قوشجی کو سونپی گئی، اور انھوں نے اس امر خطیر کو انجام تک پہونچایا چنانچہ طاشکبریٰ زادہ نے موخر الذکر کے ترجمہ میں لکھا ہے،

| | |
|---|---|
| ثم ان الامیر الغ بیگ بنی | پھر امیر الغ بیگ نے سمرقند میں رصدگاہ |
| موضع رصد بسمرقند وصرف | تعمیر کرائی اور اس پر رقم خطیر صرف کی. |
| فیہ مالا عظیما وتولاہ اولاً | پہلے غیاث الدین جمشید کاشی کو جو اس علم |

---

[1] تذکرہ دولت شاہ ص ۲۴۶ - [2] بابر نامہ ص ۳۱

غیاث الدین جمشید من مهرة هذا العلم فتوفاه الله تعالیٰ فی اوائل الامر ثم تولاه المولیٰ قاضی زاده الرومی. فتوفاه الله تعالیٰ قبل اتمامه[1] واکمله المولیٰ علی القوشجی. فکتبوا ما حصل لهم من الرصد وهو المشهور بالزیج الجدید لالغ بیگ وهو احسن الزیجات واقربها من الصحة"۔

(ہیئت) کے ماہرین میں سے تھے اسکا منتظم علیٰ بنایا (مگر) اللہ تعالےٰ نے انھیں اس کام کی ابتداء ہی میں اٹھا لیا پھر (رئیس التذکرہ) مولیٰ قاضی زادہ رومی کو اس کی سربراہی دی (مگر) اسکے مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بھی اللہ تعالےٰ کو پیارے ہو گئے، اور اس کام کو مولیٰ علاء الدین علی قوشجی نے تکمیل تک پہونچایا، پس جو باتیں ارصاد (مشاہدات فلکی) سے معلوم ہوئیں انھیں ایک کتاب میں قلمبند کیا جو زیج جدید الغ بیگ کے نام سے مشہور ہے، اور وہ سب زیجوں میں سب سے عمدہ اور سب سے زیادہ صحیح ہے۔

اسی تفصیل کو انھوں نے دوسری جگہ قاضی محمود کے ترجمہ میں قاضی زادہ کے ذکر کے سلسلے میں بیان کیا ہے،

ثم ان الامیر الغ بیگ قصد رصد الکواکب لما رای من الخلل فی ارصاد المتقدمین فرتب مکان الرصد بسمرقند

پھر امیر الغ بیگ نے مختلف ستاروں کی رصد کا ارادہ کیا کیونکہ اُس نے متقدمین کے ارصادات میں خلل عظیم پایا لہٰذا اُس نے سمرقند میں رصد گاہ تعمیر کرائی،

---

[1] الشقائق، ص ۱۱۰-۱۲۸،



فتولاه اولاً غیاث الدین جمشید فلم یلبث الا قلیلاً حتی مات ثم تولاه قاضی زاده الرومی فتوفاه الله تعالیٰ قبل اتمامه وکمله المولیٰ علی بن محمد القوشجی[1]

پہلے اس نے غیاث الدین جمشید کاشی کو اس کا متولی مقرر کیا مگر اُن کا کچھ ہی عرصہ بعد انتقال ہو گیا، پھر قاضی زادہ رومی کو اس کی تولیت عطا کی، انھیں بھی اللہ تعالیٰ نے رصد کے مکمل ہونے سے پہلے اٹھا لیا، اور اس فریضہ کو مولیٰ علی بن محمد قوشجی نے پورا کیا۔

لیکن زیادہ تفصیلی تذکرہ خود الغ بیگ نے اپنی "زیج" کے دیباچہ میں دیا ہے، پہلے تو وہ ریاضی و ہیئت میں تبحر و تمہر حاصل کرنے کے لیے اپنی مساعی کا ذکر کرتا ہے۔

"باتوزع بال و تکثر اشغال از تکفل مصالح اُمم و تعہد مناہج بنی آدم بر مقتضی المرء یطیر بجناح ہمتہ و قصاری ہمت بر احراز قصبات کمال و استجماع مآثر فضل و افضال محصور و مقصور داشتہ اعنہ سعی جمیل و ازمہ جد جزیل بجانب استحصال حقائق علمیہ و استحضار دقایق حکمیہ معطوف و مصروف گردانید تا توفیق الٰہی رفیق سعی این ضعیف گشتہ بر وفق فرمودہ من طلب شیئاً وجد بقلم فطنت و خامہ فکرت غوامض علوم و دقایق فنون لاسیما علوم حکمی کہ تغیر ملک و ادیان و اختلاف حکم زمان غبار تغیر و تبدل پیرامون آن نگردد مبین و مکشوف گردانید"[2]

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے، پھر اپنے ہیئتی منصوبہ پر عمل پیرا ہونے کی وجہ بتاتا ہے کہ اس سے مقصود محض دنیا میں ایک یادگار چھوڑنا ہے، [عام طور سے مورخین نے

---

[1] الشقائق صفحہ ۱۹-۲۰ [2] زیج الغ بیگ۔ دیباچہ (مخطوطہ مذکورہ بالا) ص ۲ ظ

جو لکھا ہے کہ اس ہیئتی منصوبہ سے الغ بیگ کا مقصد پچھلی زیجوں اور تقویموں میں پیدا شدہ خلل کی تصحیح و تسدید تھا، دیباچہ سے کسی طرح اُس کی تائید نہیں ہوتی ]

"چوں حضرت باری عز اسمہ از خزانہ کریم عمیم وان من شئ الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم این بندۂ فقیر را بچنیں موہبتے عظمیٰ و مکرمتے کبریٰ شرف اختصاص و امتیاز بخشید، خواست تا مضمون شعر

ان آثارنا تدل علینا      فانظروا بعدنا الی الآثار

برکتابہ غرائب نگار روزگار نگاشتہ آید و رایت افتخار و اشتہاد بر قمہ قبہ فلک دوار افراشتہ، رصد ستارگان اختیار فرمودہ"[1]

اس کے بعد رصد کے کام کی ابتدا کا ذکر کرتا ہے [ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ کاروبار رصد میں مولانا معین الدین کاشی بھی شریک تھے، مگر الغ بیگ نے دیباچہ میں ان کا نام نہیں لیا، ابتدائی کارکنوں میں مولانا قوشجی کا بھی نام نہیں ہے، اگرچہ بعد میں رصدگاہ کی تولیت انھیں ہی تفویض کی گئی تھی، ممکن ہے وہ سفر کرمان سے اس وقت تک واپس نہ آئے ہوں، یا اس وقت تک اس کام کے لیے اپنی صلاحیت کا ثبوت نہ دے سکے ہوں، مگر مولانا معین الدین کاشی اس کام میں شریک نہیں تھے، حالانکہ وہ غیاث الدین جمشید کاشی کے ہم مرتبہ تھے، ممکن ہے، ۸۲۳ھ سے پہلے ہی اُن کا انتقال ہو چکا ہو ]

"و باعانت و امداد حضرت استادی و سندی علامۃ العالم، ناصب امارات الفضل والحکم سالک مسالک التحقیق، ناہج مناہج التدقیق مولانا صلاح الملۃ والدین موسیٰ المشتہر بقاضی زادہ رومی علیہ الرحمۃ والغفران و حضرت مولانا

[1] زیج الغ بیگ: دیباچہ (مخطوطہ مذکورہ بالا) ص ۲ ظ



مولانا الاعظم افتخار الحکماء فی العالم مکمل علوم الاوائل، کاشف معضلات المسائل مولانا غیاث الملۃ والدین جمشید بردا اللہ مضجعہ کہ ضمیر منیر ہر یک شمع انجمن دانشوری بل جام جہاں نمائے فضل گستری بود، اتفاق شروع افتاد"[1]

ازاں بعد کہتا ہے کہ یہ دونوں فاضل تھوڑے تھوڑے عرصہ سے اللہ کو پیارے ہو گئے، اور پھر اس نے مولانا قوشجی کی مدد سے [ جو ممکن ہے کہ یا تو سفر کرمان سے اس دوران میں آ گئے ہونگے یا اگر وہیں رہے ہوں تو اب اس قابل ہو گئے ہونگے کہ اس اہم خدمت کی تنہا ذمہ داری سنبھال سکیں ] اس منصوبہ کو تکمیل تک پہونچا کر اپنی دریافتوں کو "زیج جدید" میں مدون کیا۔

"و در مبادی حال حضرت مولانائے مغفور مبرور غیاث الدین جمشید طاب ثراہ ندائے اجیبوا داعی اللہ را بسمع اجابت تلقی نمودہ از دار الغرور بدار السرور رحلت نمود و در اثنائے حال پیش از آنکہ ایں مہم ساختہ و پرداختہ آید حضرت استادی شکر اللہ مساعیہ بجوار رحمت پروردگار پیوست، پس باتفاق فرزند ارجمند علی بن محمد قوشجی . . . . . . . . .

بعون عنایت الٰہی و فیض فضل نامتناہی ایں مہم خطیر عسیر با تمام رسانیدہ آمد"[1]

[ عام طور پر رصدگاہ کے متولیوں کی جو ترتیب مشہور ہے، الغ بیگ کی تصریح سے اسکی بھی تائید نہیں ہوتی، بلکہ اگر اولیت ذکر اولیت مرتبہ کی مشیر ہو سکتی ہے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ رصدگاہ کے سربراہ اول ہمارے رئیس التذکرہ تھے، جو غیاث الدین جمشید کی اعانت سے یہ کام انجام دیتے تھے، مگر جب موخر الذکر کا انتقال ہو گیا تو تنہا انھوں نے اس بار گراں کو اٹھایا، یہاں تک کہ اُن کی وفات پر مولانا قوشجی کو یہ فریضہ انجام دینا پڑا، لیکن غالباً علی حد تک دونوں نام کے لیے سربراہی اور نگرانی خود الغ بیگ ہی کی تھی، ]

[1] زیج الغ بیگ - دیباچہ - ص ۲ ظ

**وفات** | سال ولادت کی طرح قاضی زادہ کا سال وفات بھی معلوم نہیں ہے، حاجی خلیفہ نے ۸۱۵ھ میں وفات بتائی ہے، مگر یہاں ان سے یقیناً سہو ہوا ہے، کیونکہ وہ تعمیر رصدگاہ کے بعد ایک معتد بہ عرصہ تک اس کے متولی رہے؛ اور چونکہ یہ رصدگاہ ۸۲۳ھ یا ۸۲۴ھ میں بننا شروع ہوئی تھی، اس لئے وہ ۸۲۴ھ تک یقیناً بقید حیات تھے، اور چونکہ ۸۴۱ھ میں اس رصدگاہ کی ارصادی سرگرمیوں کے نتائج قلمبند ہوئے، اور یہ کام مولانا قوشجی نے انجام دیا جو قاضی زادہ کی وفات کے بعد رصدگاہ کے متولی مقرر ہوئے تھے، اس لئے وہ یقیناً ۸۴۱ھ سے پہلے وفات پا چکے تھے،

بنا برین قاضی زادہ نے ۸۲۴ھ اور ۸۴۱ھ کے مابین وفات پائی، اور اس سترہ[1] سال کے عرصہ میں جب کہ ارصادی سرگرمیاں مکمل ہونے والی تھیں، انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

"در اثنائے حال پیش از انکہ ایں ہم ساختہ پرداختہ آید۔"

بخلاف غیاث الدین جمشید کاشی کے جو رصدگاہ کی ارصادی سرگرمیوں کے آغاز ہی میں رہگزار ملک عدم ہوگئے تھے۔

"در مبادی حال . . . غیاث الدین جمشید . . . ندائے اجیبوا داعی اللہ . . . تلقی نمود۔"[1]

اسلئے اگر یہ فرض کیا جائے کہ انھوں نے ۸۳۵ھ کے قریب (چند سال آگے یا چند سال پیچھے) وفات پائی تو یہ مفروضہ حقیقت سے بعید نہ ہوگا۔

**اعزہ واقارب** | تاریخ وتذکرہ کی کتابوں میں نہ تو ان کے تاہل و ازدواج کا پتہ چلتا ہے،

[1] زیج الغ بیگ۔ دیباچہ ص ۲ ط



اور نہ ایک بہن کے سوا کسی اور عزیز قریب کا حسب تصریح طاشکبری زادہ ان کے والد کا جوانی ہی میں انتقال ہوگیا تھا، اس لئے ممکن ہے انھوں نے یہی دو بچے چھوڑے ہوں (قاضی زادہ اور اُن کی بہن)، مگر شاید روم میں اُن کے کچھ اعزہ واقارب ضرور تھے جن کی یاد کسک بنکر انھیں تڑپایا کرتی تھی اور جسے وہ سمرقند کے مہمان نواز دربار اور الغ بیگ کے خلوص ومحبت سے متاثر ہوکر بھلانے کی کوشش کیا کرتے تھے جیسا کہ وہ خود اپنے میزبان کی تعریف میں باندازِ "تاکید المدح بمایشبہ الذم" اعتراف کرتے تھے :-

ولا عیب فیہم الا ان ضیوفہم تلام بنسیان الاحبۃ والوطن

[ان لوگوں (الغ بیگ اور اہل ماوراء النہر) میں اس کے سوا اور کوئی عیب نہیں ہے کہ ان کے مہمان (ان کی مہمانداری اور خلوص ومحبت سے متاثر ہوکر) اپنے احباب (قدیم) اور وطن عزیز کو بھول جاتے ہیں، (اور اُن کی اس کمزوری کی وجہ سے) لومۃ لائم کا نشانہ بنتے ہیں،]

**تصانیف** | "تذکرہ وتراجم نیز مختلف کتب خانوں کی فہارس کے مطالعہ سے ان کی مندرجۂ ذیل تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) شرح اشکال التاسیس (۲) شرح چغمنی (۳) شرح ہدایۃ الحکمہ مولانازادہ پر حاشیہ، (۴) تحریر المجسطی محقق طوسی پر حاشیہ (۵) رسالۃ الجیب۔

تصانیف پر تبصرہ "آثار" کے ضمن میں آرہا ہے۔

**تلامذہ** | تلامذہ کی فہرست میں سب سے پہلا نام تو خود بادشاہ الغ بیگ کا ہے، جو خود ان کی شاگردی پر فخر کرتا ہے، جیسا کہ "زیج جدید سلطانی" کے مذکور الصدر اقتباس سے ظاہر ہے، طاشکبری زادہ نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔

| | |
|---|---|
| وکان الامیر المذکور محبًا للعلوم | امیر مذکور (الغ بیگ) کو علوم ریاضیہ کا |
| الریاضیۃ فقرأ علیہ | بہت زیادہ شوق تھا، لہٰذا اس نے ان سے |
| من العلوم الریاضیۃ | (قاضی زادہ) سے علوم ریاضیہ کی بہت سی |
| کتبا کثیرۃ[1] | کتابیں پڑھیں۔ |

دوسرے مشہور شاگرد مولانا علاء الدین علی قوشجی تھے، چنانچہ طاشکبریٰ زادہ ان کے ترجمے میں لکھتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| قرأ المولی المذکور علی علماء | مولانا قوشجی نے علمائے سمرقند سے تعلیم حاصل |
| سمرقند وقرأ علی المولیٰ | کی نیز مولائے فاضل قاضی زادہ رومی |
| الفاضل قاضی زادہ الرومی | کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، انھوں نے |
| فقرأ علیہ العلوم الریاضیۃ[2] | قاضی زادہ سے علوم ریاضیہ پڑھے۔ |

تیسرے مشہور شاگرد، جن کے ذریعہ اُن کا سلسلۂ تلمذ طاشکبریٰ زادہ تک پہونچتا ہے، مولانا فتح اللہ شروانی تھے، چنانچہ وہ ان کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| العالم الفاضل الکامل | عالم وفاضل کامل مولی فتح اللہ شروانی |
| المولی فتح اللہ الشروانی | رحمۃ اللہ نے سید شریف سے علوم عقلیہ |
| رحمہ اللہ تعالیٰ قرأ | وشرعیہ پڑھا اور قاضی زادہ رومی سے |
| العلوم العقلیۃ والشرعیۃ | سمرقند میں ریاضی کے علوم پڑھے۔ |
| علی السید الشریف وقرأ | |
| العلوم الریاضیۃ علی قاضی [illegible][3] | |

[1] الشقائق ص ۱۱ [2] ایضاً ص ۱۷۰ [3] ایضاً ص ۱۱۵



مولانا فتح اللہ شروانی سے قاضی زادہ کی "شرح چغمنی" اور "شرح اشکال التاسیس" کو مولانا محمد نکساری نے پڑھا اور ان سے ان کے بھانجے نے جو طاشکبریٰ زادہ کے والد تھے، اور اپنے والد سے طاشکبریٰ زادہ نے، چنانچہ انھوں نے اول الذکر کے ترجمہ میں ان باتوں کی صراحت کی ہے۔

| | |
|---|---|
| المولیٰ فتح اللہ ۔۔۔۔ قرأ | مولیٰ فتح اللہ ۔۔۔۔ نے علوم |
| العلوم الریاضیۃ علیٰ | ریاضی کی تحصیل قاضی زادہ سے کی تھی، |
| قاضی زادہ ۔۔۔ فقرأ علیہ | ۔۔۔۔ ان سے (مولیٰ فتح اللہ سے) |
| ۔۔۔ خال والدی المولیٰ | میرے والد کے ماموں مولیٰ محمد نکساری |
| محمد النکساری ۔۔۔۔ | نے ۔۔۔۔ شرح اشکال التاسیس |
| شرح اشکال التاسیس وشرح | اور شرح چغمنی پڑھی، یہ دونوں کتابیں |
| الجغمنی کلاھما من تصانیف | قاضی زادہ رومی کی تصنیف ہیں، مولیٰ |
| المولی قاضی زادہ الرومی | فتح اللہ نے اسی طرح مستفید کیا جس طرح انھوں |
| وافادہ کما سمعہ من | نے شارح سے سنا تھا، اور مولیٰ محمد نکساری |
| الشارح فاقرأھما المولی | نے میرے والد کو یہ دونوں کتابیں اسی طرح |
| محمد النکساری للمولیٰ [illegible] | پڑھائیں جس طرح انھوں نے مولیٰ فتح اللہ |
| الوالد کما سمعہ من مولیٰ | سے پڑھا تھا، اور میرے والد صاحب نے |
| فتح اللہ۔ فاقرأھما المولیٰ | مجھ ناچیز کو انھیں اسی طرح پڑھایا جیسے |
| الوالد لھذا العبد الضعیف[1] | انھوں نے ان کا سماع کیا تھا۔ |

[1] الشقائق۔ ص ۱۱۵

# امیر خسروؒ کی صوفیانہ شاعری

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

امیر خسرو کی فارسی شاعری محض شاعری نہیں بلکہ ایک اعجاز ہے، قصیدہ گوئی ہو، مثنوی نگاری ہو، غزل سرائی ہو شاعری کی ہر صنف میں اپنا اعجازانہ کمال دکھاتے رہے، شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ امیر خسرو کے کلام میں جو برکات ہیں وہ گنہ گاروں کے دل میں نہیں پائی جا سکتی ہیں، برکات سے محروم لوگوں کے کلام کو مقبولیت اور قلبی اثر حاصل نہیں ہو سکتا، (اخبار الاخیار ص ۹۷-۹۹) مولانا شبلی بھی رقمطراز ہیں، کہ امیر کا ہر شعر جو بجلیاں گراتا ہے، وہ اسی وادی ایمن یعنی تصوف کی شرر باریاں ہیں (شعر العجم حصہ دوم ص ۱۲۹) انکے اشعار پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خاص مجازی انداز میں کہے گئے ہیں، مگر اسی کے ساتھ یہ احساس ہوتا ہے کہ انکے اشعار کیا ہیں، بلکہ بقول مولانا شبلیؒ آگ سے دھواں اٹھ رہا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ڈبڈبائی ہیں روتے روتے ٹھہر جاتے ہیں، اور جب رو لیتے ہیں تو آگے بڑھ جاتے ہیں، ان کی طبیعت میں یہ سوز یہ گداز اور یہ درد آ گئی اس صوفیانہ کیفیت سے پیدا ہوئی، جو ان کو فطری طور پر حاصل تھی، اور جس کی جلا ان کے مرشد کی صحبت میں ہوتی رہی، ان کی مثنویوں



قصیدوں اور غزلوں میں بعض ایسے اشعار ہیں، جن میں وہی عارفانہ کیفیات بھری ہوئی ہیں، جو اس راہ میں محسوس ہوا کرتی ہیں، اس کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کرنے سے پہلے راقم کی خواہش ہے کہ اہل نظر اور صاحب دل نے مختلف مواقع کی کیفیت کے لئے ان کے اشعار کا سہارا کس طرح لیا، اس کا ذکر آ جائے تاکہ آیندہ راقم جو کچھ عرض کرے اس کی تائید ہو جائے،

امیر خسرو کے معاصروں میں سیر الاولیاء کے مؤلف نے ان کے اشعار کثرت سے نقل کر کے اپنی تحریروں میں خاص روحانی کیفیت پیدا کر دی ہے، ہم یہاں کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء جمعہ کی نماز سے پہلے تجرید فرماتے، یعنی اپنے انبار خانوں اور مخزنوں کو بالکل خالی کر دیتے، اور وہاں جھاڑو دلوا دیتے کہ فتوحات میں سے کوئی چیز باقی نہ رہنے پائے، تجرید کے وقت بادشاہ یا کسی شہزادہ کی طرف سے کوئی آدمی پہونچ جاتا، فتوحات لاتا، ان کے آنے کے دبدبہ کا شور حضرت خواجہ کے کان میں پڑتا، تو وہ ٹھنڈی سانس لیتے اور اپنے سینۂ مصفا سے ایک آہ کھینچ کر فرماتے یہ لوگ ایک درویش کے وقت کو غارت کرنے کے لیے کہاں سے آ گئے، سیر الاولیا کے مصنف کا بیان ہے، کہ امیر خسرو کا یہ شعر ایسے ہی موقع کے لیے موزوں ہوا ہے،

تو کہ بر در تو کم شد سرِ تاج بادشاہان چہ خیال فاسد است ایں کہ من گدا ت جویم

(سیر الاولیاء، ص ۱۳۱)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے ایک ممتاز مرید شیخ تاج الدین تھے پہلے دنیا میں ملوث رہے، پھر اسکو چھوڑ کر حضرت خواجہ کے ہاتھ پر بیعت کی، فقر اور فاقہ کر کے مجاہدہ کو اپنی دولت سمجھنے لگے، سیر الاولیا نے اس سلسلے میں امیر خسرو کا یہ شعر نقل کیا ہے،

ملکتِ عشق ملک شد از کرم الٰہی ام — پشت من و پلاس غم نیست قبای شاہی ام

(صفحہ ۳۱۲)

مولانا شمس الدین دامغانی حضرت خواجہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے تو سیرالاولیا مصنف نے اپنی خوشی کا اظہار امیر خسرو کے اس شعر کے ساتھ کیا ہے،

سعادت ابدی در پے ارادت تست — چنانکہ عید مبارک ز بعد ماہ صیام

(صفحہ ۳۵)

سیرالاولیا کے مصنف کا بیان ہے کہ جمعہ کی رات کو انھوں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت خواجہ کی مجلس سجی ہوئی ہے، وہ وہاں حاضر ہوئے تو حضرت خواجہ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا، اور فرمایا کہ تجدید بیعت کر لو، اس سے میری روح میں ایک تازگی پیدا ہو گئی کیونکہ یہ میرے دل میں بھی بات تھی، حضرت خواجہ نے تجدید بیعت کرایا، جس سے میں بہت خوش ہوا اور مجھ پر گریہ طاری ہو گیا، امیر خسرو کا کیا خوب شعر ہے۔

ہمہ شب گریہ ام خفتن نداده است — کہ بوئے گل رخِ من با صبا بود

(صفحہ ۳۶۴)

حضرت خواجہ کی یہ تعلیم تھی کہ اہل تصوف عشق الٰہی میں وقت گذاریں اور خواہ مخواہ شہرت حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ آخرت میں سزا پائیں گے، اسی بات کو امیر خسرو نے اس طرح کہا ہے،

باش تا پردہ بر اندازد جہاں از روئے کار — آنچہ امشب کردۂ فردات گردد آشکار

خود امیر خسرو نے کبھی پیر بننے کی خواہش ظاہر نہ کی، صرف حضرت خواجہ کے در سے



وابستہ ہی رہنا پسند کیا، کہتے ہیں،

زنجیر سگان در خود بر سر من بند — اکنون سر این نیست کہ دستار بہ بندم

حضرت خواجہ کی یہ بھی تعلیم تھی کہ محبت الٰہی میں دن اور رات یکساں ہے محبوب کی محبت کی بے قراری میں نیند نہیں آتی، اور نیاز حاصل کرنے کے لئے گریہ وزاری ضروری ہے، اس سے مشاہدہ میں ترقی ہوتی ہے، اس کے لئے رات کا وقت موزوں ہوتا ہے، جو اس نعمت کا طالب ہوتا ہے، تو اس کو خواب و قرار کی کیا ضرورت ہے، اسی لیے امیر خسرو نے کہا ہے۔

خواب ز چشم من بہ شد چشم تو بست خوابِ من — تاب نماند در تنم زلفِ تو برد تابِ من

(صفحہ ۴۵)

ایک بار حضرت خواجہ نے سوز عشق پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ سینہ کی آہ سے دریا بھی خشک بیابان ہو سکتا ہے، امیر خسرو نے اسی کو اس طرح قلمبند کیا ہے،

در بازآہ سینۂ من خشک شد چنانکہ — بر گریہ چشم خویش نہ بیند کسے نمے

موجودہ دور کے جن اصحابِ نظر نے امیر خسرو کی شاعری کا مبصرانہ اور غائرانہ مطالعہ کیا ہے، ان کو بھی امیر خسرو کے یہاں بکثرت عارفانہ رنگ کے اشعار ملے ہیں، مثلاً امیر خسرو کے دیوان وسط الحیوٰۃ کو جناب فضل احمد حافظ نے ایڈٹ کیا، تو اپنے دیباچہ میں امیر خسرو کی یہ غزل نقل کرتے ہیں۔

بیا ساقی کہ ما در مے افتادیم — بخدمت پیش مے خواراں ستادیم

سر رندی جو کج کردیم در عشق — کلاہِ صوفیاں ہم کج نہادیم

بہ جور ساقیان میریم بارے　　　چو داد طاعت و تقوی دادیم

ان اشعار کی تصریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں، کہ قطع منازل سلوک کا اظہار رندانہ انداز میں کیا گیا ہے، حاصل یہ ہے کہ ہمنے انانیت (خودی) کو مٹانے اور عشق صادق پیدا کرنے کے لیے اہل محبت کی خدمت اختیار کرلی ہے، اور اپنا ظاہر و باطن یکساں کرنے کے لیے کسی تکلف اور تصنع کو روا نہیں رکھا، کلاہ زاہد اگر کج ہی سہی، طاعت و تقوی کا التزام نہ ہو لیکن ساقی (مرشد کامل) کی نظر لطف درکار ہے، جب یہ ہم ہر دم نثار ہیں، یہ تمام حقایق مجاز کے رنگ میں رنگے ہیں، پھر وہ امیر خسرو کی ایک اور غزل نقل کرتے ہیں،

بیا تا پے گل و صہبا نباشم　　　کہ گل باشد بسے در ما نباشم

چو تنہا بودنی باید ہمان بہ　　　کہ از ہم صحبتان تنہا نباشم

بیا جانا دمارا باش امروز　　　چو میدانی کہ ما فردا نباشم

چو بگزارند یکجا دوستان را　　　چرا با دوستان یکجا نباشم

ان اشعار کی تصریح وہ اس طرح کرتے ہیں کہ گل و صہبا سے مراد جذبات محبت جو کاملین کی صحبت سے حاصل ہوتے ہیں، دوسرے شعر میں گور کی تنہائی پر اشارہ کرتے ہوئے ترغیب صحبت نیکاں ہے، تیسرے شعر میں حسن استدلال کے طور پر درخواست ہے، کہ جب کہ کل ہم نہ ہوں گے تو صرف آج کے لیے اگر تم میرے پاس آجاؤ تو کیا حرج ہے، آخری شعر میں صحبت دوستان غنیمت شمر کو ادا کیا ہے، اور وجہ وہی خوف تفرقہ ہے کل یا آئندہ کل ضرور واقع ہوگا۔

ایک اور مسلسل غزل نقل کی ہے،

اگر اصحاب عشرت مے پرستند　　　بیا ساقی کہ من ساقی پرستم



مرا گویند در مستی چہ دیدی　　　کہ می گوئی دل اندر بادہ بستم

تعالی اللہ ازیں بہتر چہ باشد　　　کہ از ننگ وجود خویش رستم

ان اشعار کو اس طرح سمجھایا ہے کہ عشاق کی پہلی منزل ترک جاہ و مال و نام و ننگ ہے، اور سب سے آخری ننگ وجود سے رستگاری یعنی مرشد کامل کی توجہ سے مرتبۂ فنا حاصل ہونا جو اعلی درجہ مقامات سلوک ہے،

امیر خسرو کے یہ اشعار بظاہر عاشقانہ معلوم ہوتے ہیں،

خواہم کہ بکوے تو دم جہاں بسپارم　　　صد جان دگر در عوض از کوئے تو آرم

گر خلق جہان زندہ بجانند ولیکن　　　من زندۂ عشقم کہ شہید غم یارم

مگر جناب فضل احمد حافظ صاحب نے ان کی اس طرح تشریح کی ہے کہ عوام کے غم کے خلاف زندگی اور غم یار کو شہادت سے تعبیر کیا ہے، عشاق کے نزدیک کوئی دولت غم دوست (یعنی محبوب حقیقی) سے زیادہ عزیز نہیں، جس کا دوسرا نام عشق ہے جناب فضل احمد حافظ صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ امیر خسرو کتمان عشق کے قائل تھے، یعنی خفائے عشق کی خاطر زباں سے محبوب کو جان کہنے میں تامل ہو. یہ استدلال ان اشعار سے کیا،

غمت با این و آن گفتم نہ گفتم　　　اگر چہ ترک جان گفتم نہ گفتم

نزا جان گفتم از دل در تو دانی　　　کہ من آن از زبان گفتم نہ گفتم

فضل احمد حافظ صاحب ا. یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو فضیلت عشق کے قائل تھے، ان کے نزدیک انسان اور جمادات کے درمیان عشق و سوز ہی مابہ الامتیاز ہے،

ہر دل بے عشق را من دل نہ گویم　　　تن بے سوز را جز گل نہ گویم

پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو عشق کو عقل پر فضیلت دیتے تھے،

(انوار)

شکایت نادرم از عشق بر عقل　　جفائے شحنہ بر عامل نگویم
مگو با من کہ عاقل نیست عاشق　　کہ من بے عشق را عاقل نگویم

مولانا سید سلیمان اشرف نے جب امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کو ایڈٹ کیا، تو اس کے طویل مقدمہ میں امیر خسرو کے تصوف کو بھی بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھایا، جس کا خلاصہ یہ ہے،

امیر خسرو علیہ الرحمہ جہاں کہیں مسائل تصوف بیان کرتے ہیں، وہ ان کی حالت کا آئینہ ہوتا ہے، اس پر بیان کا ایک خاص زور اور وضاحت کلام کا ایک لطیف انداز ایسا ہوتا ہے کہ حسن بیان پر بلاغت، بلاغت پر فصاحت اور فصاحت پر ہزار شیرینی قربان ہے، مسائل تصوف میں الٰہیات کا حصہ خاص اہمیت رکھتا ہے، خواجہ فرید الدین عطار، حکیم سنائی، مولانا رومی، نظامی گنجوی، ان سے قبل اور سعدی ان کی حیات میں اس طرح ان مسائل کو بیان کر چکے تھے کہ عقل حیران تھی کہ اب ان مسائل کے بیان کا کون سا جدید عنوان ہوگا، لیکن خسرو علیہ الرحمہ نے جب ان ہی مسائل کو بیان کیا تو معلوم ہوا کہ بیان کا یہ پہلو خسرو کا منتظر تھا، مثلاً یہ مسئلہ کہ انسان جو عالم امکان میں سب سے افضل ہے، اور اس کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں، یہ اگر اس امر کی کوشش کرے کہ حقیقت الٰہ سے آگاہ ہو جائے تو یہ ناممکن و محال ہے، علم ممکن حقیقت واجبہ کا احاطہ تو کہاں کر سکتا ہے، وہاں تک اس کی رسائی بھی محال ہے، اسی مضمون کو سعدی نے کہا ہے۔

تو ان در بلاغت بہ سحبان رسد　　نہ در کنہ بے چون سبحان رسد

لیکن اب خسرو کو دیکھو کہ کس نئے انداز سے بیان کرتے ہیں،



ہر چہ از تو گمان برم بہ چونی　　آن من بوم و تو زان برونی

انسان کی عقل جد و جہد کرتی ہے، مقدمات ترتیب دیتی ہے، حقائق اشیائے سے بحث کرتی ہے، صفات و خواص سے آگاہ ہوتی ہے، قدم و حدوث کا مسئلہ تحقیق کرتی ہے، ان سب مراحل کے بعد ایک نتیجہ پر پہونچتی ہے، اور چاہتی ہے کہ اسے حقیقت الٰہ قرار دے لیکن جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساری گردش گردش پرکار تھی، دائرۂ امکان سے ذرہ برابر بھی قدم آگے نہ بڑھا، تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے، سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ۔ اس ایک شعر کو دیکھو چند سادے الفاظ میں کس وضاحت سے آیۂ کریمہ کی معنی خیز تفسیر کی ہے، کس طرح دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے، یہ ہے زور کلام اور حسن بیان،

اس عقیدہ کو کہ اللہ تعالےٰ عالم الغیب ہے، اور جو کچھ عالم کون میں ظاہر ہوتا ہے، وہی مقتضائے مصلحت ہے، وجود و عدم دونوں اس کے تحت حکم ہیں، نیستی و ہستی کوئی بھی حکمت سے خالی نہیں، کس صفائی و روانی سے نظم کا جامہ پہنایا ہے،

دانندۂ توئی بہر چہ راز است　　سازندہ توئی بہر چہ ساز است
از بودنی ہر چہ بود دارد　　از تو رقم وجود دارد
وانچہ از عدم ست نام او نیز　　از حکمت تست ماندہ نا چیز
بود ہمہ گشتہ از تو موجود　　حکم تو روان بہ جود و نابود

صرف عقل علت معرفت باری تعالےٰ ہے، یا نہیں، اس کا جواب یوں دیتے ہیں،

لوامع صنعتش ہست چشم پوش عقول　　چو آفتاب کہ نورش حجاب بصارست
حکیم گفت شناسم بہ عقل یزدان را　　زہے کمال حماقت وہ این چہ گفتار

کنہ باری تعالےٰ تک عرفاء کی رسائی ہے یا نہیں، اس کا کیسا خوبصورت جواب دیا ہے،

بکنہ حق نرسد عارف ارچہ داند دست　　بر آسمان نہ پرد جعفر ارچہ طیار ست

اس مسئلہ کو کہ دنیا کی ہر شے سے معرفت حق حاصل ہے یوں بیان کرتے ہیں،

ہر صحیفہ برگ است نور حکمت او　　نوشتہ چون لقب شہ برے دنیا رست

تصوف میں الہیات کے بعد وہ مسائل ہیں جن کا تعلق سالک کی ذات سے ہوتا ہے، مثلاً انسان کو راضی برضا ہونا چاہیئے، اور کسی حالت میں شریعت کے دائرہ سے قدم باہر نہ نکلنے پائے، ان باتوں کو یوں سمجھاتے ہیں،

انچہ مقدر شدہ است چون نبود بیش و کم　　گر برسد خرمیم ور نہ رسد باک نیست

حرص بجاکت کشد شارع دین گیر زانکہ　　بے روشِ مصطفٰے راہ بر افلاک نیست

راہ تصوف میں مجاہدہ کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، قدم قدم پر ایثار و قربانی کرنا چاہیئے اسکو عمدہ مثالیں دے کر خوبصورتی سے سمجھاتے ہیں،

گاوِ دغا در صفِ مردان مرد　　نام نبرد آن کہ خدنگے نخورد

طبل کہ سوراخ کنندش بہ پوست　　بہر بروں رفتن آواز اوست

تا نشود خستہ بصد جادلت　　نور حقائق نہ شود حاصلت

چہرہ سنگ ارنہ کنی گو بگو　　دانہ کجا سود شود جو بجو

دل کیا ہے، اس کی کیا قدر ہے، اس کی زندگی کیا ہے، اس کی موت کیا ہے؟ ان امور کو جس شاعرانہ پیرایہ اور محققانہ طریقہ سے بیان کیا ہے، ان ہی کا حصہ ہے، کہتے ہیں،

چون تن آدم بہ گل آراستند　　خانہ جہان بہر دل آراستند

آدمی آن نیست کہ دردے دل ست　　ور نہ علف خانہ آب و گل ست

دل نہ ہمان قطرہ خون است و بس　　کز خورد آشام بر آرد نفس



دل اگر این مہرہ آب و گل ست　　خواہم از اقبال تو صاحب دل ست

لیک دل آن شد کہ ہوائے دروست　　وز طرفے بوئے وفائے دروست

زندہ بجان خود ہمہ حیوان بود　　زندہ بدل باش کہ عمر آن بود

زندگی دل چہ بود سوز و چاک　　زندگی کالبدی چیست خاک

غمزدہ بہ جان کہ غم اندر نیست　　سوختہ بہ دل کہ درو سوز نیست

سردی دل مردگی دل بود　　خون چو بہ تن سرد شود گل بود

عشق کی کیا شان ہے، عشاق کی کیا روش ہے، عشق کا کیا درجہ ہے، ان باتوں کو اس وجد و کیف سے بیان . . کرتے ہیں کہ اگر ذرا غور کیا جائے تو دل روحانی سرور سے معمور ہو جاتا ہے،

عشق زبانی ز ہر افسردہ پرس　　سوزش آن از دل آزردہ پرس

ذوق نمک گرچہ زبان را خوش ست　　چون بہ جراحت نگنی آتش ست

موم بود دل کہ ز عشق ست زار　　کو بگداز او فتد از یک شرار

شعلہ عشق چو شد خانگی　　سوختہ شد عقل بہ پروانگی

زندہ ہم آنست کہ جائے دروست　　اوست کہ از عشق نشانے دروست

جان کہ نہ عشقش بود آن بازی ست　　عشق نہ بازی ست کہ جاں بازی ست

چند بری عشق بہ بازی پسر　　عشق دگر باشد و بازی دگر

مرد کہ در عشق ز جان فرد نیست　　گر صف کافر شکند مرد نیست

چون تو فغان از سر خارے کنی　　بہ کہ جز از عشق شمارے کنی

مرد وہی ہے، جو ابتلا و امتحان کے میدان میں جرأت اور استقامت سے

مقابلہ کرے۔

مردنہ ترسد ز فقر شیر نہ ترسد ز زخم — مذہب عیار نیست بیم عسس داشتن

عذر عروسان بود دعوی مردی و بس — گاہ وغا تیش خصم روے بہ پس داشتن

سب سے وسیع ترین تصوف کا وہ حصہ ہے جس میں عشقیہ روش کی آمیزش ہوتی ہے، اس کی بنیاد سعدی علیہ الرحمہ نے ڈالی جس پر ایک قصر عالی شان خسرو اقلیم سخن نے تعمیر کر دیا، بیان کی اس صفت میں خصوصیت کے ساتھ ان کا تخیل بہت ہی بلند پایہ رکھتا ہے، اپنے تخیل کو جسمانی جامہ پہنا کر اس طرح پیش کر دیتے ہیں، جس سے ان کا تخیل تخیل باقی نہیں رہتا بلکہ وہ گوشت و پوست و استخوان سے درست ملکوتی روح پھونکی ہوئی مورتیں ہوتی ہیں، مثلاً

گل اندر خوابگاہ نرگس افتد چو وز دلو بت — ولیکن عشق بازان را بساط در خوابگاہ افتد

ز چشمت کاروانِ صبر من تاراج کا خر شد — مسلمانان کسے دید ست کاندر شہر راہ افتد

فصل نوروز کہ او در طرب برہمہ خلق — چشم بد دور مراسم باران آورد

ہر سحر باد کہ بر سینہ من کرد گزر — در چمن بوے کباب از پے مستان آورد

ان ہی اشعار کو دیکھو تخیل کیسا اعلیٰ ہے، اور پھر کلام میں کس طرح درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے کہ دل تڑپ کر رہ جاتا ہے، یہ شاعرانہ حیثیت سے بھی اعلیٰ مظہر ملکوتی عالم میں حسن وعشق حقیقی کے خیالات میں محو اور دوسرے نازک ترجذبات و لطافت میں غرق زندگی بسر کرتے تھے . . . . . . ان کا عاشقانہ کلام مردہ دلوں کے لیے آب حیات کا کام کر رہا ہے،

جہاں سے چاہو اٹھا کر دیکھو ایک چھوڑ ہزار ثبوت پاؤ گے . . . . .

یہاں صرف دو مثالیں دی جاتی ہیں،



برداے اے یار پیش دیگران وہ جلوہ بستان را

مرا بگزار تا می بینم آن سرو خرامان را

گرفتار خیالات پیش گشتم یقین باشد

اگر ہر گہ نگس در خواب بیند شکرستان را

مپرس از من کہ چون می باشد آخر جانِ غمناکت

کہ من دیریست کز یادش فراموش کردہ ام جان را

---

تن پاکت کہ زیر پیرہن ست — وحدہ لاشریک لہٗ چہ تن ست

اندر آ۔ درمیان جان بنشین — کہ تو جانی نہ جان من بدن ست

تازیم در غم تو جامہ درم — وز پس مرگ نوبت کفن ست

دل خسرو خوش ست با تنگی — کہ مرا یادگار زان دہن ست

اس دردآگینی کی وجہ صاف ہے ان کو اہل دل گروہ سے واسطہ تھا، ناسوت، ملکوت، جبروت، لاہوت اور ان چاروں سے ماورا جو عالم ہیں ان کی سیر سے ان کی چشم بینا بصارت حاصل کیے ہوئے تھی، اور انھیں عالموں کی آب و ہوا میں ان کے قوائے باطنی نے پرورش پائی تھی، دل خستہ تھا، اور آتش عشق سے برشتہ، زبان صرف دل کی ترجمان تھی، اور بس خسرو دل کی برشتگی و سوختگی کچھ ازل ہی سے لے کر آئے تھے جس کو چشتی نسبت نے اور بھی بھڑکا دیا تھا، اس پر شیخ طریقت حضرت سیدنا نظام الدین اولیا سلطان المشائخ محبوب الٰہی رضی اللہ عنہ بحرمتہ کی توجہ ظاہری و باطنی جب پڑتی تو اس آتش کی شعلہ فشانی افسردہ دلوں کو اور بھی جلا کر خاکستر کر دیتی۔ (صفحہ ۸۰،۰۰)

متقدمین اور متاخرین نے امیر خسرو کے اشعار کا تجزیہ جس عارفانہ رنگ میں کیا ہے،

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موقع بموقع ان کے اشعار کا سہارا لے کر روحانی سکون حاصل کیا جاسکتا ہے، ان کے مجازی اور عاشقانہ رنگ کے اشعار میں بھی عارفانہ رنگ پایا جاتا ہے، ان کا عاشقانہ کلام مردہ دلوں کیلئے آب حیات کا کام کرتا ہے، ان کے تخیل میں ملکوتی روح پھونکی ہوئی معلوم ہوتی ہے، وہ عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں، اس لیے ان عشقیہ اشعار میں بڑی درد آگینی ہوتی ہے، وغیرہ وغیرہ، مگر ان کے کلام کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سوز عشق کی چنگاریاں اڑتی دکھائی دیتی ہیں، ان کے مرشد نے ان کو نصیحت کی تھی کہ معشوقوں کے زلف وخال کے ساتھ اصفہان کے شعراء کے طرز پر عشق انگیز کلام کہا کریں، ان کا کلام اسی اجمال کی تفصیل ہے، وہ زلف وخال کے پردے میں سوز عشق کا اظہار کرتے رہے، یہ سوز ان کے سینہ میں کہاں سے آیا، فطری تھا، پیدائشی تھا، ازلی تھا، یا یہ اپنے مرشد سے پایا، ان کے مرشد کے کسی مرید کے سینہ میں یہ سوز پیدا نہیں ہوا اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ یہ انکے سینہ میں خدا کی طرف سے ودیعت ہوا جسمیں اور بھی زیادہ برشتگی اور خستگی انکے مرشد کی وجہ سے پیدا ہوگئی پھر ان کا سوز اتنا مشہور ہوا کہ اس کے ساتھ افسانوی رنگ پیدا ہوتا گیا، بعض تذکرہ نگار یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ ان کے سینہ کے پاس کا کپڑا سوز عشق کی حرارت اور گرمی سے جلا رہتا، کچھ تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ بھی فرماتے کہ کل قیامت میں ہر ایک شخص کسی شے پر ناز کریگا، اور اے ترک میں تیرے سوز سینہ پر ناز کرونگا، اکثر دعا میں یہ فرماتے کہ

الٰہی بہ سوز سینۂ این ترک مرا بہ بخش

(ہشت بہشت، مقدمہ ص ۸)

انکی شاعری اسی سوز عشق کا مظہر ہے، جو کبھی عشق الٰہی کبھی عشق رسول کبھی مرشد کبھی عشق کائنات، کبھی عشق مناظر فطرت، کبھی وطن، کبھی عشق آقائے شاہی، کبھی عشق والدین اور کبھی عشق اولاد میں ظاہر ہوتا رہا۔ (باقی)



# گجراتؒ کے ایک نامور محدثؒ ومورخؒ

## شیخ عبدالقادر عیدروسی

منصور نعمانی ندوی، رفیق دارالمصنفین

(۲)

**تصانیف** | شیخ عبدالقادر عیدروسی نے اپنی پوری زندگی رشد وہدایت کے لیے وقف کردی تھی، اور سلسلۂ عیدروسیہ کی ترویج واشاعت کو انھوں نے وظیفۂ حیات بنالیا تھا، بایں تقویٰ وطہارت تصنیف وتالیف کا بھی بڑا اچھا ذوق فیاض ازل نے ودیعت کیا تھا، تصنیف وتالیف کے میدان میں انھوں نے اپنی وسعت نظر، کثرت علم اور بے مثل مطالعہ کے نقوش ثبت کئے ہیں، مگر شیخ ان مظلوم مصنفین میں سے ہیں جن کی زیادہ تر کتابیں منظر عام پر نہ آسکیں، اس کے باوجود وہ عزت وشہرت کے نصف النہار پر پہونچے، اور ارباب تراجم وتذکرہ سے مورخ وصوفی کا لقب پایا، انکی کچھ کتابیں دست برد زمانہ کی نذر ہوگئیں، کچھ کتب خانوں میں محفوظ ہیں، انھوں نے خود اپنے سوانح حیات میں بائیس[۲۲] کتابوں کے نام تحریر کئے ہیں، صاحب المشرع الروی نے انکی دو کتابوں کا اور ذکر کیا ہے، صاحب اعلام اور جرجی زیدان نے ایک اور کتاب کا سراغ لگایا ہے بوہار کی فہرست مخطوطات میں تین مزید کتابیں نظر پڑیں، اسطرح انکی تعداد اٹھائیس ہوجاتی ہے بروکلمن نے کتابوں کی تعداد صرف بچیس لکھی ہے صاحب معجم المطبوعات کا بیان ہے کہ انھوں نے مفید کتابیں سپرد قلم کیں، اور ان کی شہرت ملک بھر میں پھیل گئی، ان کی تصانیف میں یہ پہلو بھی نمایاں نظر آتا ہے کہ انھوں نے علم کی ہر شاخ کو ثمر بار کیا ہے

سیرت نبوی، سیر الصحابہ، تاریخ و سوانح، اخلاق و تصوف، دین و عقیدہ، حدیث و تفسیر اور شعر و ادب
علوم و فنون کی شاید ہی کوئی صنف ہو جس پر انھوں نے ایک بیش بہا ذخیرہ نہ چھوڑا ہو۔
اگر موصوف کی تمام مخطوطات مطبوعات کی صورت میں منصۂ شہود پر آجائیں تو علم و فن کی
بڑی خدمت کے ساتھ شیخ کے علوم و فنون میں کامل بصیرت و مہارت کا ثبوت ہوگا،
ہم کو ان کی صرف دو مطبوعہ کتابیں دستیاب ہو سکیں، النور السافر اور تعریف الاحیاء
ان کا تفصیلی تعارف کرایا جائے گا، ان کے علاوہ ان کی دوسری کتابوں کا ہم ذیل میں
اجمالی ذکر کریں گے۔

۱۔ الفتوحات القدوسیہ فی الخرقۃ العیدروسیہ، یہ مصنف علام کی مشہور
و مقبول کتاب ہے، اس کتاب میں سلسلۂ عیدروسیہ کے جامع تعارف کے ساتھ
اس سلسلہ کے بانی اور دیگر مشائخ اور اپنے والد کے حالات اور اس سلسلہ کے
اشغال و اذکار کا تفصیل سے ذکر ہے، یہ کتاب خاصی ضخیم ہے، مصنف نے اسے
۹۹۷ھ میں لکھا تھا، یہ حسن اتفاق ہے، کہ اس کتاب کی تاریخ بھی اس کے نام سے
مطابقت رکھتی ہے، مشہور شاعر مخدوم زادہ نے لبس خرقۃ سے تاریخ نکالی ہے،[۱]
شیخ عبد القادر کو اپنی اس کتاب پر بڑا فخر و ناز تھا، انھوں نے لکھا ہے کہ اس سے
پہلے ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی۔[۲]

۲۔ حدائق الحضرہ فی سیرۃ النبی و اصحابہ العشرۃ، اس کتاب کا موضوع نام سے
ظاہر ہے، اس کے سلسلہ میں شیخ کا بیان ہے کہ "یہ میری پہلی کتاب ہے، اور یہ اسوقت
لکھی گئی جب میری عمر بیس سال کی تھی"۔

۱؎ النور السافر ص ۴۴۵ ۲؎ ایضاً ص ۳۳۸



۳۔ اتحاف الحضرۃ العزیزۃ بعیون السیر الوجیزہ۔ یہ حدائق کا خلاصہ ہے طرز
و تحریر اسی طرح دلکش ہے،
۴۔ المنتخب المصطفیٰ من اخبار مولد المصطفیٰ، اس کے بارے میں شیخ لکھتے ہیں کہ
اس کے اسلوب بیان پر صلحائے امت نے دل کھول کر داد دی ہے۔
۵۔ المنہاج الی معرفۃ المعراج، یہ رسالہ معراج نبویؐ کے متعلق ہے،
مولانا عبد الحیؒ حسنی لکھتے ہیں کہ متذکرۂ بالا چاروں کتابیں عربی میں ہیں، اور سیرت
کے موضوع پر بے نظیر ہیں۔[۱] ان چاروں کتابوں کے کسی نسخہ کا کسی کتب خانہ میں ذکر
نہیں ملا۔
۶۔ الانموذج اللطیف فی اہل بدر الشریف:۔ اس کے بارے میں مصنف کا
دعویٰ ہے کہ اہل بدر کے مناقب و فضائل اس سے پہلے اس انداز میں نہیں لکھے گئے ہیں، یہ
کتاب میری زندگی کا قابل فخر کارنامہ ہے، اس کی بنا پر میں خدائے عز و جل سے جنت
کا امیدوار ہوں۔[۲] اس کے مخطوطہ کے بھی ہمیں علم نہیں ہو سکا۔
۷۔ اسباب النجاۃ و النجاح فی اذکار المساء و الصباح:۔ یہ اُن اذکار و اوراد کے
بارے میں ہے، جو صبح و شام پڑھے جاتے ہیں، اس کا بھی کسی کتب خانہ میں پتہ نہیں چلا،
۸۔ الدر الثمین فی بیان المہم من علم الدین:۔ اس کا ایک مخطوطہ بوہار میں
پایا جاتا ہے، مخطوطہ کا نمبر ۳۵۳ ہے، یہ کتاب چار ابواب پر منقسم ہے، پہلے باب میں
عقائد، دوسرے میں احکام و قواعد اسلام تیسرے میں اخلاق اور چوتھے میں تقوی کا بیان ہے۔

۱؎ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند مطبوعہ دمشق ص ۹۰ ۲؎ النور السافر ص ۳۳۹
۳؎ النور السافر و فہرست مخطوطات بوہار جلد ۲ / ۴۹۹

۹۔ الحواشی الرشیقۃ علی العروۃ الوثیقۃ:۔ مصنف نے اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن کوئی تفصیل نہیں دی ہے، یہ کسی کتب خانہ کی فہرست میں بھی نظر نہیں آئی۔

۱۰۔ فتح الباری بختم صحیح البخاری:۔ اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے، بوہار کی فہرست میں مخطوط نمبر ۲۵۴ کا تیسرا حصہ "رسالۃ فی مناقب بخاری" ہے، جسے شیخ کی تصنیف قرار دیا گیا ہے، لیکن کچھ تفصیلات درج نہیں ہیں[1]

۱۱۔ عقد اللآل بفضائل الآل:۔ اس میں اہلبیت کے فضائل و مناقب بیان کیے گئے ہیں، فہرست بوہار میں اس کے ایک مخطوط کا پتہ چلا ہے، مخطوط نمبر ۲۵۳ (حصہ ۲) پر ہے، اور یہ شروع ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

"الحمد للہ الذی خص آل البیت النبوی بحقائق العلوم والمعارف الالٰھیۃ"

یہ حسب ذیل ابواب میں منقسم ہے۔ القسم الاول وفیہ أبواب، باب وصیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب الحث علی حبھم و القیام بواجب حقھم، باب مشروعیۃ الصلوٰۃ علیھم، باب دعائہ صلی اللہ علیہ وسلم بالبرکۃ فی ھذا النسل، باب الامان ببقائھم، باب خصوصیاتھم الدالۃ علی عظم کرامتھم، باب اکرام الصحابۃ ومن بعدھم لأھل البیت، باب مکافاتہ لمن أحسن الیھم، باب التحذیر من بغضھم وسبھم۔ القسم الثانی فی ذکر فاطمۃ الزھراء [رضی]، القسم الثالث، فی وقائع دالۃ علی عنایۃ اللہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] فہرست بوہار ۵۰۲/۲



وابنتہ الزھراء بأھل البیت۔ اس نسخہ کی کتابت (مصنف کی زندگی میں) ربیع الاول ۱۰۱۷ھ میں ابوبکر بن محمد المکی کے ہاتھوں ہوئی ہے[1]

۱۲۔ خدمۃ السادۃ آل باعلوی باختصار العقد النبوی:۔ اس میں عیدروسی سادات کی خدمات نبوی کا غالباً جائزہ لینا مقصود ہوگا، مصنف نے لکھا ہے، کہ "میں اللہ سے امید کرتا ہوں کہ میری زندگی میں یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے"[2] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتاب تیزی سے لکھ رہے تھے، مگر مکمل نہ کر سکے، اس لئے تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں ان کی اس کتاب کا ذکر نہیں آتا۔

۱۳۔ بغیۃ المستفید فی شرح تحفۃ المرید:۔ معلوم ہوتا ہے کہ تحفۃ المرید اس زمانہ میں بہت متداول تھی، اس لئے اس کی شروح بہت لکھی گئیں، شیخ کے والد نے دو شرحیں لکھی تھیں پھر خود شیخ نے ایک مختصر شرح لکھی، اس کا ایک نسخہ بوہار میں مخطوطہ نمبر ۲۵۴ کے مجموعہ رسائل پر موجود ہے[3]

۱۴۔ النفحۃ العنبریۃ فی شرح البیتین العدنیۃ:۔ اس کی تفصیل نہ کسی کتاب میں ملی نہ کسی قلمی نسخہ کا پتہ چل سکا۔

۱۵۔ غایۃ القرب فی شرح نہایۃ الطلب:۔ اس سلسلہ میں شیخ نے لکھا ہے کہ "اس شرح کے ساتھ لوگوں نے بہت اعتناء کیا، اور علماء نے اس کو یاد کرنے کا مشورہ دیا" مگر اس وقت اس کے کسی نسخے کا کسی کتب خانہ میں پتہ نہیں چلتا۔

۱۶۔ شرح قصیدۃ الشیخ ابی بکر العیدروس النونیۃ:۔ یہ اس کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں، "یہ عبارت کی آسانی اور فہم مطالب میں سہولت اور حسن بیان کی دل آویزی میں ممتاز ہے،

[1] فہرست بوہار ۵۰۰/۲ [2] النور السافر ص ۳۳۹ [3] فہرست بوہار ۵۰۸/۲

بوہار کی فہرست مخطوطات عربی میں شرح القصیدۃ النونیہ کے عنوان سے مخطوطہ نمبر ۲۳۳ پایا جاتا ہے، اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

"الحمد للہ الذی خلق الانسان فی احسن تقویم الخ" پھر اس شعر سے آغاز ہوا۔

کل من یبس یمنع نفسہ　　عن حفیض الطوی ذاق الھوان [1]

۱۷۔ اتحاف اخوان الصفا بشرح تحفۃ الظرفاء باسماء الخلفاء: اس کے بارے میں مصنف نے کچھ اظہار خیال نہیں کیا ہے، بوہار کے مخطوطہ نمبر ۲۰۰ پر یہ شرح موجود ہے، اس کی ابتدائی عبارت یہ ہے۔

"الحمد للہ رب العالمین الذی علمنا ما لم نکن بہ عالمین"

الحمد للہ حمد الانفاذ لہ　　وانما الحمد حقا راس من شکرا [2]

۱۸۔ الفتح القدسی فی تفسیر آیۃ الکرسی: یہ آیۃ الکرسی کی تفسیر ہے، بوہار کی فہرست میں ایک تو اسی نام سے اور ایک آیۃ الکرسی کے نام سے موجود ہے مخطوطہ نمبر ۵۰، ۵۴ کے مجموعہ میں یہ رسالہ موجود ہے۔ [3]

۱۹۔ صدق الوفا بحق الاخاء: احمد بن محمد باجابر مشہور ادیب، شاعر، فقیہ اور عالم تھے۔ وہ شیخ عیدروسی کے چہیتے شاگرد، اور خاص حاضر باشوں میں تھے، گردش روزگار سے شاہی عتاب کی زد میں آئے، اور سلطان نے برادو لاہوران کو زہر دلوادیا، جس سے جانبر نہ ہوسکے، اس دلدوز واقعہ نے استاد عیدروسی کو بے حد صدمہ پہنچایا اس رسالہ میں باجابر کے کمالات علم وفضل کا بیان ہے، اس کے بارے میں شیخ نے انھیں "واحد العلماء ودرۃ تاج الفضلاء" کے القاب سے یاد کیا ہے، بوہار میں مخطوطہ نمبر ۴۵

---

۱؎ فہرست بوہار ۲/ ۲۰۸　۲؎ بوہار ۲/ ۲۳۵　۳؎ ایضاً ص ۵۰۲



(نمبر دوم) پر پایا جاتا ہے، ایک نسخہ اس کا برلین کی لائبریری میں بھی پایا جاتا ہے۔ [1]

۲۰۔ الروض الاریض والفیض المستفیض: یہ شیخ عیدروسی کے مجموعۂ اشعار کا نام ہے، اس دیوان کے کسی قلمی نسخہ کا پتہ نہ چل سکا، البتہ اشعار کے نمونے النور السافر میں جابجا بکھرے نظر آتے ہیں جن سے ان کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے، ان اشعار میں حکمت وموعظت کا گراں بہا خزانہ ہے، عشق ومعرفت میں ڈوب کر شعر کہنا اور خیالات کے اظہار اور تصادم سے بچ نکلنا کمال شاعری ہے اور یہ خوبی ان کے کلام میں موجود ہے۔

۲۱۔ روح الراح وراح الارواح: شیخ نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، اس کا ذکر صرف بوہار کی فہرست میں مجھے مل سکا، اس کے مقدمہ کے الفاظ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ عیدروسی کے جو اشعار سلوک ومعرفت سے متعلق ہیں، ان کی تشریح اس میں کی گئی ہے، میرا خیال ہے کہ دیوان الروض الاریض میں سلوک کا باب ہوگا، اور یہ اسی باب سے متعلق شرح ہے، میرے اس خیال کی تائید مقدمہ کے ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ "الحمد للہ الذی شرح صدور اولیائہ بنور معرفتہ وبعد فقد من اللہ تعالی علی ولہ الحمد بان وفقنی لنظم ابیات قلتہا فی السلوک الی ملک الملوک ثم خطر لی ابراز معانیہا الدقیقۃ واظہار رموزہا المشیرۃ الی الطریقۃ فوضعت ہذہ الوریقات لتقیید تلک الرشحات فجاء بحمد اللہ تعالی شرحا فائقا فی فنہ بدیعا فی حسنہ وسمیتہ، روح الراح وراح الارواح۔" یہ مخطوطہ نمبر ۱۲۵ پر موجود ہے۔ [2]

۲۲۔ فتح الجواد بشرح سعاد: بانت سعاد کی سیکڑوں شرحیں لکھی گئیں، شیخ نے بھی اس کی شرح کی ہے، مگر اس کا ذکر اپنے تذکرہ میں انھوں نے نہیں کیا ہے۔ لیکن

---

۱؎ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ۳/ ۳۱۵　۲؎ بوہار ۲/ ۱۳۸-۱۳۹

اس کا ایک مخطوطہ بوہار میں پایا جاتا ہے، اس کا نمبر ۲۳۴ ہے۔[1]

۲۳۔ الاعتقادیۃ۔ اس کا ذکر ہیں صرف بوہار کی فہرست میں نظر سے گزرا،[2] میرا خیال اس کتابچہ کے سلسلہ یہ ہے کہ صفحات گذشتہ میں ان کی کتابوں میں الدرالثمین نامی کتاب کا تفصیل سے تعارف کرایا گیا ہے، اس میں عوام کی تفہیم کے لیے بنیادی دینی عقائد کو پہلے باب میں "الباب الاول فی العقیدۃ" کے تحت بیان کیا گیا ہے، غالباً اسی باب کو کسی نے الگ کر دیا، اور اس کو الاعتقادیہ کا نام دیدیا۔

۲۴۔ الروض الناضر فی من اسمہ عبد القادر من اہل القرنین التاسع والعاشر — دسویں صدی کے اعیان واکابر کے حالات میں عیدروسی کی مشہور زمانہ کتاب النور السافر موجود ہی ہے۔ یہ نویں دسویں صدی کے ان علماء ومشائخ کا مبسوط تذکرہ ہوگا، جن کے نام عبد القادر تھے، اس میں بہت تلاش وتفحص سے کام لیا گیا ہے، اگر یہ گرانمایہ کتاب منظر عام پر آجائے تو کمالات عیدروسی کا ایک نیا گوشہ سامنے آجائے۔ اس کتاب کا ذکر انہوں نے اپنی کتابوں کے ذیل میں نہیں کیا، البتہ زرکلی نے اس کا ذکر کیا ہے۔[3] جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ اس کا ایک قلمی نسخہ برلین کی لائبریری میں پایا جاتا ہے۔[4]

۲۵۔ الزہر الباسم من روض حاتم ۱۔ شیخ عیدروسی کے استاد، بزرگ اور قریبی رشتہ دار سید حاتم الاہدل، بڑے صاحب کمال بزرگ، نامور عالم، ممتاز ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے، سلوک وتصوف میں بلند مقام حاصل ہونے کی وجہ سے عیدروسی نے ان کو ابن عربی کے لقب سے یاد کیا ہے۔[5] ان کا انتقال سنہ ۱۰۱۳ھ

---

[1] بوہار ۲/۲۶۶ [2] ایضاً ص ۵۰ [3] الاعلام ۲/۵۳۳ [4] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ۳/۳۱۵ [5] النور السافر ص ۱۶۱



میں ہوا۔ عیدروسی نے اپنے استاد کی کتاب روض کی شرح دو ضخیم جلدوں میں لکھی، اس وقت النور السافر ختم کر چکے تھے، اس لئے اس میں اس کا ذکر نہیں ہے، مورخ شلی نے اس ذکر کیا ہے،[1] مورخ محبی نے اس شرح کا نام "الدر الباسم" لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ اس کتاب کے کسی قلمی نسخہ کا پتہ نہیں چل سکا۔

۲۶۔ قرۃ العین فی مناقب الولی عمر بن محمد باحسین۔ اس میں ولی کامل عمر بن محمد باحسین کے حالات وکمالات بیان کئے گئے ہیں، غالباً یہ بھی دور آخر کی تصنیف ہو، مورخ شلی نے اس کا ذکر کیا ہے، اس کے کسی قلمی نسخہ کا علم نہ ہو سکا۔

۲۷۔ تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء ۱۔ یہ شیخ کی مشہور تصنیف ہے، اس کے سبب تالیف کے بارے میں خود ان کی زبانی سنئے: "ہمارے سردار عبد اللہ العیدروس نے فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کے گناہ معاف کرے، جو میرے کلام کو غزالیؒ کے کلام سے متشابہ قرار دے" میں نے اسی دعا کی لالچ میں اسے لکھا ہے، اس تصنیف سے والد مرحوم کی خواہش کی بھی تکمیل ہوگئی، جو فرمایا کرتے تھے، کہ اگر زمانہ مہلت دے تو میں شیخ عبد اللہ کے کلام کو غزالی کے کلام سے ملاؤں اور اس کتاب کا نام الجوہر المتلالی من کلام الشیخ عبد اللہ فی الغزالی رکھوں، یہ کتاب انھیں کے کلام ان ہی کی کتابوں اور ان ہی کی تعریف پر مشتمل ہے،[2] سلسلۂ عیدروسیہ کی بنیاد امام غزالیؒ کی ہی کتاب ہے، عیدروسی نے اس کتاب کو ایک مقدمہ ایک مقصد اور ایک خاتمہ میں تحریر کیا ہے، مقدمہ میں تو عنوان کتاب ہے، اور مقصد کے باب میں احیاء العلوم کے فضائل، مدائح اور اکابر کے تعریفی کلمات ہیں، اور ان باتوں کا رد ہے، جس کے سبب صاحب احیاء العلوم کو مطعون کیا جاتا ہے

---

[1] المشرع الروی بحوالہ خلاصہ ۲/۴۴۲ [2] النور السافر ص ۳۳۹

اور خاتمہ مصنف کے حالات زندگی اور تصوف و سلوک کی منزل کو اختیار کرنے کے باب میں ہے،
عیدروسی امام غزالی کو عالم العلماء وارث الانبیاء، حجۃ الاسلام، حسنۃ الدهور والاعوام تاج المجتهدین جیسے
بلند القاب سے یاد کرتے ہیں۔ . . . . . احیاء العلوم علماء اور عاملین کے
نزدیک نفع و برکت کی بڑی دولت خیال کی جاتی ہے۔[1] علم سلوک و معرفت پر اس سے بہتر
کتاب نہیں ہے یہ شریعت، طریقت اور حقیقت پر مشتمل ہے غوامض و اسرار کو واضح کرتی ہے[2]
میرے والد شیخ بن عبد اللہ (متوفی سنہ ۹۹۰ھ) اس کا بڑی پابندی سے مطالعہ
فرماتے انھوں نے اس کے بہت سے نسخے حاصل کئے تھے، طالبین کو اس کا درس دیتے تھے،
اور جب ختم ہوتی تو ایک بڑی شاندار ضیافت فرماتے، میں نے بھی والد کی اس سنت کو
جاری رکھا۔[3]

یہ رسالہ کل ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے، مگر احیاء العلوم کے فضائل و مناقب اور فوائد
پر بڑی جامعیت سے بحث کی گئی ہے، احیاء العلوم قاہرہ سے چار جلدوں میں سنہ ۱۳۰۶ھ
میں شائع ہوئی، اس کے حاشیہ پر دو عظیم الشان کتابیں طبع ہوئیں ایک تو تعریف الاحیاء
(عیدروسی) اور دوسری عظیم کتاب عوارف المعارف (سہروردی) ہے،[3] مگر ہمارے
پیش نظر وہ نسخہ ہے، جو دو جلدوں میں حنائی کاغذ پر ۱۳۲۲ھ میں مطبع میمنیہ مصر
سے شائع ہوئی، اور پہلی جلد میں صرف صفحہ ۴۶ تک یہ طبع ہوئی ہے اس کے بعد عوارف
المعارف ہے،

۲۰ - النور السافر عن اخبار القرن العاشر :- یہ عیدروسی کی وہ عظیم الشان
اور شہرۂ آفاق کتاب ہے، جس کی بدولت وہ شہرت و عظمت کے فلک الافلاک پر

---

[1] تعریف الاحیاء بہامش احیاء العلوم ص ۳ [2] ایضاً ص ۱۲ [3] اکتفاء القنوع ص ۱۹۰



پر پہونچے ان سے پہلے حافظ ابن حجر نے آٹھویں صدی کے مشاہیر کے حالات پر الدرر الکامنہ اور حافظ سخاوی
نے نویں صدی کے اکابر کے تذکرہ میں الضوء اللامع لکھی تھی، علامہ عیدروسی کو اس موضوع پر
کتاب لکھنے کا خیال غالباً ابن حجر اور سخاوی کی انھیں تذکرہ بالا کتابوں کو دیکھ کر آیا
اور انھوں نے دسویں صدی کے علماء و اعیان پر ایک ضخیم تذکرہ لکھ دیا، یہ تذکرہ ان
دونوں تذکروں سے اگرچہ ضخامت میں بہت کم ہے، لیکن بایں ہمہ بڑا بیش قیمت اور
ایک ہندوستانی عالم کا شاہکار ہے، اگر ابن حجر کی کتاب نقش اول اور سخاوی کی کتاب
نقش ثانی ہے، تو علامہ عیدروسی کی یہ کتاب نقش ثالث کا درجہ رکھتی ہے، ابن حجر کی کتاب
دائرۃ المعارف حیدرآباد سے ۱۳۴۸ھ میں چار جلدوں میں، سخاوی کی کتاب مکتبہ
قدسی قاہرہ سے ۱۳۵۵ھ میں بارہ جلدوں میں اور عیدروسی کی کتاب المکتبۃ العربیہ
بغداد سے ۱۳۵۳ھ میں ایک جلد میں شائع ہوئی ہے، یہ صدی وار سلسلۃ الذہب
کی ایک تابناک کڑی ہے، اس لئے اس کا جائزہ ذیل کی سطور میں پیش کیا جارہا ہے۔

النور السافر دسویں صدی کے اکابر علماء، امراء، اور صوفیہ و مشائخ کا مستند
تذکرہ ہے، ویسے تو سیکڑوں علماء کا اس میں ذکر ہے، لیکن قابل ذکر علماء میں حافظ سخاوی،
حافظ سیوطی، علامہ قسطلانی، علامہ دوانی، قاضی زکریا انصاری، علامہ عبدالحق سنباطی،
جمال الدین زبیدی، ابن حجر مکی، علی متقی بن حسام الدین، قطب الدین نہروالی مفتی
مکہ، قاضی وجیہ الدین گجراتی، عثمان دیلمی، اور علامہ بحرق وغیرہ کا تذکرہ بہت
جامع و مفصل ہے، اس میں متذکرہ بالا علماء کے حالات زندگی اور کارہائے حیات
کا ایسا اچھا مرقع پیش کیا گیا ہے، کہ ان علماء کی سوانح حیات لکھتے وقت النور السافر
کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے،

امراء و سلاطین میں ملک قاتیبای جرکسی، محمد بن برکات والی مکہ، ملک مصر ناصر ابن قاتیبای، محمود بن احمد سلطان گجرات، سلطان یمن عامر بن عبدالوہاب، سلیمان اعظم رومی، سلطان سلیم، بایزید عثمانی، امیر مرجان ظافری، ہمایوں بن بابر، مظفر شاہ گجراتی، سلطان محمود شاہ، سلیم شاہ بن شیر شاہ، برہان نظام شاہ سلطان دکن، احمد وغیرہ کے حالات و مآثر اور ملکی خدمات پر سیر حاصل بحث کی ہے، مشائخ و صوفیاء کے تذکرہ میں بھی یہ کتاب اہم مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے، عیدروسی سلسلہ کے بیشتر مشائخ و اولیاء کے حالات اس کتاب میں تفصیل ملتے ہیں، ان میں سراج الدین عمر بن عبداللہ العیدروس، شیخ بن عبداللہ العیدروس، طاہر بن الحسین اہدل، شیخ ابوبکر ابن سالم باعلوی، عبداللہ بن سعد الدین مدنی، عبداللہ ابن الفقیہ، احمد بن علوی، شہاب الدین بن شیخ عبدالرحمٰن باعلوی، شہاب الدین احمد بن علی حلبی، سید عبداللہ علوی ابوبکر العیدروس، حسین بن عبداللہ العیدروس خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

**سبب تالیف** النور السافر لکھنے کی غرض و غایت کیا تھی، اسے مصنف نے اس طرح بیان کیا ہے: "میں نے اس کتاب میں دسویں صدی کے اکابر کے حالات مع تاریخ وفات درج کئے ہیں، اس طرح اس میں علماء، قضاۃ، صلحاء، ادباء، شعراء، امراء اور سلاطین کے حالات درج ہو گئے، ان کے ذکر میں کسی ملک و قوم کی تخصیص نہیں ہے اس کے اندر مصری، شامی، حجازی، یمنی، رومی، ہندی غرض مشرق و مغرب کے ممتاز لوگوں کا تذکرہ ہے، اسی کے ساتھ بعض حوادث، عجائب و غرائب، حکایات و لطائف کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے، میں نے وہی حالات بیان کئے ہیں جن سے واقف ہوں، اس طرح یہ کتاب حدیث، فقہ، تاریخ اور ادب کا بیش بہا خزینہ



بن گئی"۔ (مقدمہ النور السافر ص ۲)

**اسلوب نگارش** عیدروسی کا اسلوب نگارش اس عہد کے رنگ سے ہم آہنگ ہے، وہ دور سجع و قوافی کا تھا، اس لئے ان کے یہاں بھی اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، مگر اسکے باوجود تعقید، ابہام یا اشاریت کا وجود نہیں گویا وضاحت اور شگفتگی ان کے طرز تحریر کا طغرائے امتیاز ہے، اس سے ان کے تبحر علمی اور ادبی کمال کا اندازہ ہوتا ہے، کیونکہ یہ کتاب محض ادبی نہیں بلکہ تاریخ و تراجم اس کا اصل موضوع ہے، اسلئے سجع و قوافی کا زیادہ التزام قائم نہ رکھ سکے، البتہ جابجا اس طرز نگارش کے نمونے ملتے ہیں،

**مآخذ کتاب** النور السافر کو خلعت دوام سے سرفراز کرنیکے لیے علامہ عیدروسی نے بڑی عرق ریزی، دماغ سوزی اور غیر معمولی جانکاہی سے کام لیا ہے، اس کا اندازہ مآخذ کی طویل فہرست سے ہوتا ہے، جن کے نام اور حوالے کتاب کے صفحات پر بے شمار مواقع پر آتے ہیں، کسی مآخذ سے مفید مطلب چیز کے حصول کے لئے جو غیر معمولی محنت کرنی پڑتی ہے، وہ ارباب نظر سے مخفی نہیں، ذیل میں مآخذ کی چند مستند کتابوں کے نام تحریر کئے جاتے ہیں۔

۱۔ الضوء اللامع :۔ یہ حافظ سخاوی کی شہرہ آفاق کتاب ہے، عیدروسی نے اسکا بار بار حوالہ دیا ہے، اور اس کے طویل اقتباسات نقل کئے ہیں۔

(۲) امام نووی کی شرح مسلم (۳) امام ترمذی کی الجامع الترمذی،

(۴) امام بخاری کی الجامع الصحیح، (۵) تفسیر کبیر

(۶) امام واحدی کی البسیط، (۷) بقاعی کی تاریخ عنوان الزمان،

(۸) علامہ بحرق حضرمی کی مواہب القدوس فی مناقب ابن العیدروس،

(۹) قزوینی کی مشہور کتاب۔ عجائب البلدان (۱۰) قزوینی کی اخبار البلاد

(۱۱) ابن عربی کی فتوحات مکیہ۔ (۱۲) ابن حجر مکی کی معجم شیوخ۔

(۱۳) المقدسی کی شرح حال الاولیاء و مناقب الاصفیاء

(۱۴) ابن الوردی کی خریدۃ العجائب، (۱۵) سبکی کی طبقات الشافعیہ۔

(۱۶) فخر الدین رازی کی مناقب شافعی، (۱۷) صاحب قاموس مجد الدین فیروز آبادی کی کتاب البلغۃ فی تاریخ ائمۃ اللغۃ۔ وغیرہ۔

متذکرہ بالا کتابوں کے حوالوں کے علاوہ لوگوں کی زبانی روایات اور دواوین عرب سے بھی بہت کچھ اخذ کیا ہے، اور اس کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ کتاب میں شامل کر دیا ہے، جس سے ان کی مورخانہ بصیرت اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔

**کتاب کی خصوصیات** جیسا کہ متذکرہ بالا سطور میں تحریر کیا گیا کہ صدی وار تذکرے اس سے پہلے بھی بہت سے ترتیب دیئے جا چکے تھے، اور تراجم و طبقات پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں تھیں، لیکن النور السافر میں ایسی خصوصیات ہیں، جن سے آٹھویں اور نویں صدی کے تذکرے الدرر الکامنہ ابن حجرؒ، اور الضوء اللامع حافظ سخاویؒ، خالی نظر آتے ہیں،
النور السافر کے مصنف اگرچہ عرب نسل کے تھے، مگر پیدائشی اعتبار سے ہندی نژاد تھے، اس لئے ان کی یہ کتاب ہندی علماء کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

۱۔ الدرر الکامنہ اور الضوء اللامع دونوں حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہیں، مگر یہ کتاب سن وار واقعات و حوادث پر مشتمل ہے، اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کا تذکرہ دیکھتے وقت بہت سے واقعات و حالات کا پتہ چل جاتا ہے،

۲۔ متذکرہ بالا دونوں کتابیں اگرچہ بہت ضخیم ہیں، مگر حالات کے بیان میں اختصار سے



کام لیا گیا ہے، جب تک دوسرے تذکروں کا سہارا نہ لیا جائے، واقعات و حالات زیادہ معلوم نہیں ہوتے۔

۳۔ دونوں کتابیں صرف اشخاص کے سوانح اور علماء کے حالات تک محدود ہیں، مگر اس کتاب میں اس صدی کے سیاسی، ادبی تاریخی واقعات بھی سوانح کے پہلو بہ پہلو مل جاتے ہیں۔

۴۔ دونوں کتابوں میں رطب و یابس بہت ہیں، معروف و غیر معروف، قابل تذکرہ و ناقابل تذکرہ، علمی و غیر علمی لوگوں کا تذکرہ ملتا ہے، جس سے ضخامت تو بہت ہو گئی، مگر کارآمد و مفید کی تخصیص و تعیین کے لیے غیر معمولی جد و جہد کرنا پڑتی ہے، اور کافی تلاش و جستجو پر گوہر مراد ہاتھ آتا ہے،

۵۔ دسویں صدی کے اشخاص و واقعات دیکھنے کے لئے یہ کتاب بہترین رہبر ہے۔

۶۔ یہ کتاب اگرچہ دسویں صدی کے آغاز سے اختتام تک صرف ایک صدی کی تاریخ کو محیط ہے، مگر اس کا آغاز تیمناً و تبرکاً سیرت نبوی کے تفصیلی ذکر سے کیا گیا ہے، جس سے مصنف کی پاک باطنی اور ذات رسالت مآب سے غیر معمولی عقیدت کا پتہ چلتا ہے، یہ بات اسے متذکرہ بالا کتابوں سے ممتاز کرتی ہے،

۷۔ بعض واقعات ایسے ہیں، جن سے معاصر تاریخوں کی تردید ہوتی ہے،

**اپنا تذکرہ** قدیم علماء کا یہ دستور رہا ہے کہ دیگر علماء کی خدمات و کمالات کا جائزہ لیتے ہوئے، "تحدیث نعمت" کے طور پر اپنا تذکرہ بھی سپرد قلم کر دیتے ہیں جس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے، کہ آئندہ نسلوں کے لیے ان کا تذکرہ مستند یادگار بن جاتا ہے، پھر اسی کی روشنی میں سوانح نگار اس کے نقوش حیات کو اجاگر

کرتے ہیں، چنانچہ عیدروسی نے بھی ۹۷۸ھ (سال پیدائش) کے ذیل میں اپنے واقعات زندگی، تصانیف اور تلامذہ پر دس صفحات میں روشنی ڈالی ہے،

**النور السافر کا ذیل**

النور السافر کا ایک قلمی نسخہ بوہار میں مخطوطہ نمبر ۳، ۲ پر موجود ہے[1]، یہ کتاب استاذ محمد رشید آفندی الصفار کی تصحیح و تحقیق کے ساتھ مطبعۃ الفرات بغداد سے ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء میں ۵۰۰ صفحات پر شائع ہو چکی ہے، اس کا ایک ذیل شلی متوفی ۱۰۹۳ھ نے لکھا ہے، جو المشرع الروی کے نام سے مشہور ہے[2]، یہ ذیل ہماری نظر سے نہیں گزر سکا،

**النور السافر کے قلمی نسخے**

ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں بھی النور السافر کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آزاد لائبریری کے حبیب گنج کلکشن میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، جو خط نسخ میں ۱۰۹۳ھ کا لکھا ہوا ہے[3] مولانا عبد العزیز میمن کی روایت کے مطابق اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ فرنگی محل میں موجود ہے[4]، ان دو گرانقدر نسخوں کے علاوہ اس کے دو نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہیں، ایک ۱۲۹۳ھ کا لکھا ہوا، اور ایک ۱۳۰۰ھ کا لکھا ہوا[5]۔

---

[1] بوہار ۲/۳۰۲ [2] تاریخ ادبیات عربی ۲/۲۰۰ [3] حبیب گنج کے تاریخی نوادر معارف جون ۱۹۳۷ء صفحہ ۴۴۶۔ [4] فہرست آصفیہ جلد سوم صفحہ ۱۸۰ و جلد اول صفحہ ۴۴۴۔



# آسٹریلیا میں اسلام اور مسلمان

## کچھ نئے معلومات

از

جناب سید شہاب الدین صاحب دسنوی

مئی ۱۹۷۹ء کے معارف میں "آسٹریلیا میں اسلام اور مسلمان" کے عنوان سے عربی رسالہ "الدعوۃ" سے ایک مضمون کی تلخیص شائع ہوئی ہے، اس سال مارچ میں مجھے آسٹریلیا کے شہر میلبورن میں پچیس ۲۵ دن قیام کا موقع ملا، اس دوران میں وہاں کے مسلمانوں کے بارے میں جو باتیں معلوم ہوئیں وہ قارئین "معارف" کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں،

آسٹریلیا جغرافیائی اعتبار سے دنیا کے قدیم ترین علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن آبادی کے لحاظ سے اس کی عمر صرف ۲۰۰ سال ہے، جب کہ کپتان کوک کے ساتھ یورپی قومیں یہاں آکر آباد ہوئیں، اُن سے پہلے یہاں کی اصلی آبادی پراچین باشندوں کی تھی، جو اب برائے نام بعض جنگلوں اور پہاڑوں میں رہ گئے ہیں،

آسٹریلیا کے علاقہ وکٹوریا میں میلبورن بڑا شہر ہے، رقبے کے لحاظ سے تو یہ لندن سے بھی وسیع تر ہے، مگر آبادی کل ۲۷ لاکھ ہے، یہاں کے اکثر حصوں کے زیادہ تر مکانات ایک یا دو منزل کے ہیں، جن کے سامنے خوبصورت پھولوں اور سرسبز جھاڑیوں کا باغیچہ ہوتا ہے، البتہ وسط شہر میں دفتروں کی سربفلک عمارتیں دکھائی دیتی ہیں، سڑکیں بہت کشادہ ہیں، دونوں

جانب سایہ دار درخت قرینے سے لگے ہوئے ہیں، اور میلوں تک سیدھی چلی گئی ہیں، شہر سے باہر بعض سڑکوں پر نوے کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے کم پر موٹر چلانا جرم میں داخل ہے، لوگوں کے لباس، مکانوں کی آرائش، دکانوں کی سج دھج اور موٹر گاڑیوں وغیرہ کو دیکھ کر بہ آسانی اندازہ لگ جاتا ہے کہ یہاں دولت کی فراوانی ہے، غربت اور افلاس کا نام نہیں، مزدوروں کی اُجرتیں بہت زیادہ ہیں، اس لئے گھر کے سارے کام کاج صفائی سے لے کر رنگ کرنے تک لوگ خود ہی کر لیتے ہیں، کارخانوں میں کام کرنے کی خاطر ان بیرونی ممالک سے مزدور بلائے جاتے ہیں، جہاں کم اجرت پر لوگ تیار ہو جاتے ہیں، میلبورن میں یونان اور ترکی کے مزدوروں کی بہت بڑی تعداد ہے،

معارف کے مذکورہ مضمون میں وکٹوریا کے مسلمانوں کی تعداد پچاس ہزار بتائی گئی ہے لیکن مجھے معلوم ہوا کہ صرف میلبورن میں پچاس سے ساٹھ ہزار ترک آباد ہیں، اس لحاظ سے پورے وکٹوریا میں مجموعی مسلم آبادی پچاس ہزار سے کہیں زیادہ ہوگی،

میلبورن کے مختلف حصوں میں کل تین مسجدیں ہیں: ایک مسجد پرسٹن میں ہے، جو ترکی مسجد کہلاتی ہے، یہ چند سال قبل بنی ہے، اس کی تعمیر جدید طرز پر ہوئی جس میں نہ گنبد ہے نہ مینارہ، یورپ کے پرانے قلعہ نما محلوں میں گول ٹاور ہوا کرتا تھا، اسی قسم کا ٹاور اس مسجد میں ایک جانب کو بنا ہوا ہے جہاں سے اذان کی آواز لاوڈ اسپیکر کے ذریعہ نشر ہوتی ہے، نماز کے بڑے ہال میں تقریباً سات آٹھ سو مصلیوں کی گنجائش رکھی گئی ہے، فرش پر دبیز قالین ہے جس پر صف کی درستگی کے لئے لکیریں بنی ہیں جس جمعہ کو میں وہاں شریک ہوا، اس روز ستر مصلی تھے جن میں پانچ چھ ہندوستانی، پاکستانی، اور باقی ترک، البانی، یوگوسلاوی وغیرہ تھے، ہال کے پچھلے حصے میں گیلری بنی ہے جس میں عورتیں جماعت میں شریک ہوتی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم دکھائی دی،



یہ خواتین برقع کے بجائے قدیم ترکی وضع کے لباس میں تھیں، جس میں چہرہ اور دونوں ہاتھ کھلے رہتے ہیں، مسجد سے متصل بڑی سی کھلی پختہ جگہ موٹروں کے پارک کرنے کے لئے رکھی گئی ہے، غالباً عید بقر عید کے موقعوں پر یہ زمین اور مسجد کے دوسرے بڑے بڑے کمرے مصلیوں کی کثیر تعداد کے مصرف میں آتے ہونگے، باقی دنوں میں یہ کمرے کلاس کے طور پر استعمال ہوتے ہیں طلبہ کے لئے جدید ڈیزائن کے ڈسک اور بنچ ہیں، اتوار اور چھٹیوں کے دنوں میں خاص طور سے قرآن مجید اور دینیات وغیرہ کی تعلیم ہوتی ہے، ترکی زبان بھی پڑھائی جاتی ہے تاکہ بچے اپنے گھر کے ماحول سے بیگانہ نہ ہو جائیں،

مُصلیوں میں بوڑھے بھی دکھائی دیئے، اور جوان بھی، بچہ ایک بھی نہ تھا، کیونکہ اس وقت وہ سب اسکول گئے ہوئے تھے، معلوم ہوا کہ عام مسجدوں میں جو رونق جمعہ کو ہوا کرتی ہے، وہ یہاں اتوار کو دکھائی دیتی ہے،

دوسری مسجد جو میری قیام گاہ سے چار پانچ میل کے فاصلے پر تھی، البانی مسجد کہلاتی ہے، یہ بہت چھوٹی ہے، جس میں مشکل سے ستر اسّی مصلی سما سکتے ہیں، میں یہاں دو جمعہ پڑھ سکا، دونوں بار نمازیوں کی تعداد ۳۰ سے ۳۲ تک رہی، ان میں ایشیائی قوم کے تین چار افراد تھے، باقی یوگوسلاوی یا البانی وغیرہ تھے، مسجد کے دروازے پر البانی رسم خط میں (غالباً) مسجد کا نام لکھا ہے،

دونوں مسجدوں میں صاف ستھرے طہارت خانے اور وضو خانے بنے ہیں، امام پہلے عربی میں خطبہ دیتا ہے، پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں سناتا ہے، خطبہ زبانی اور ہر مرتبہ نیا ہوتا ہے جس میں اللہ اور رسول کے احکام کی وضاحت اور تشریح ہوتی ہے، البانی مسجد کے امام ایک مصری نوجوان ہیں جو شہر میں اپنے مشاغل رکھتے ہیں، اور امامت کی خدمت اعزازی طور پر انجام دیتے ہیں، سلام پھیرنے کے بعد مصلی اپنے دائیں بائیں نمازیوں سے مصافحہ کرتے ہیں، مصر میں بھی یہ رواج ہے،

میلبورن کے علاوہ دوسرے شہروں اور علاقوں میں بھی مسجدیں موجود ہیں، ٹاسمانیا کے ایک چھوٹے سے مقام پر نئے امام آئے ہیں، جو بمبئی کے پروفیسر احمد بہاء الدین داور کے داماد اور میرے شناسا ہیں، ان سے صرف فون پر باتیں ہوسکیں، اگر ان کی دعوت قبول کرسکتا تو اس علاقے کی معلومات حاصل ہوجاتیں،

میرے قیام کے زمانہ میں ایک خبر نمایاں طور پر چھپی تھی، کہ میلبورن شہر میں ایک بہت بڑے اسلامی مرکز کی تعمیر کا منصوبہ تیار ہوچکا ہے، جس پر پانچ ملین ڈالر (تقریباً چار کروڑ روپیے) لاگت آئے گی، اس مرکز میں درسگاہ، کتب خانہ اور معلوماتی مرکز کے علاوہ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا انتظام، صحیح ذبیحہ گوشت کی سپلائی اور عیدالاضحیٰ کے موقع پر جانوروں کی فراہمی اور قربانی کرنے کا معقول انتظام بھی ہوگا، بعض مسلم حکومتوں نے بڑی بڑی رقموں سے اس منصوبے کی اعانت کا وعدہ کیا ہے، اس سے آسٹریلیا کی ایک اہم ضرورت کچھ حد تک پوری ہوجائے گی،

سڈنی شہر میں مسلمانوں کی انجمن کی طرف سے ایک مختصر سا رسالہ سائیکلو اسٹائل ہوکر شائع ہوتا ہے، جس میں اسلامی تقریبات "چاند کی تاریخیں" اور ان کے علاوہ قرآن مجید، حدیث، سیرۃ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوۂ صحابہ سے متعلق کچھ چھوٹی چھوٹی تحریریں بھی ہوتی ہیں، کچھ سوال وجواب کی صورت میں دینی معلومات ہوتی ہیں، مثلاً ایمان کیا ہے؟ آخرت کیا ہے؟ رسول کیوں آئے ہیں وغیرہ،

آسٹریلیا کا معاشرہ مغربی ممالک کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے، اس لئے یہاں بھی مسلمان باشندوں کو وہی مسائل درپیش ہوتے ہیں، جو یورپ یا امریکہ میں ہوتے ہیں، ان میں جمعہ کی نماز کا مسئلہ سب سے اہم ہوجاتا ہے، جمعہ کو بچے اسکولوں میں ہوتے ہیں، اور بڑے دفتروں، اور کارخانوں میں مشغول ہوتے ہیں، ہر علاقے میں مسجد نہیں، جہاں لنچ کے اوقات میں یہ لوگ بعجلت جماعت میں شریک



ہوکر پھر اپنے کاموں پر پہنچ جائیں، بچے کلاسوں میں جاکر بیٹھ جائیں، ایسے مقامات بھی خال خال ہوں گے، جہاں مسجد نہ ہوتے ہوئے مسلمان اتنی تعداد میں اکٹھے ہوسکیں، کہ کسی مقام پر جماعت سے نماز ادا کرلیں، ایسی ہی دقت بچوں کی دینی تعلیم کے معاملے میں بھی محسوس ہوتی ہے، نہ مدرسے ہیں، نہ ایسی موزوں کتابیں ہیں جو مختلف عمر کے بچوں کے لئے ان کی نفسیات اور دوسرے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہوں، اور جو طباعت کے معیار سے بھی اُن کی دوسری کتابوں سے کم تر نہ ہوں، اگر ان مسائل کے حل جلد نہ تلاش کئے گئے، تو ڈر ہے کہ کہیں مغربی ملکوں کے مسلمان اتوار ہی کو جمعہ منانا طے کرلیں؛

میلبورن یونیورسٹی میں مڈل ایسٹرن اسٹڈیز کا ایک شعبہ ہے، جس میں سندھ کے ڈاکٹر قاضی عبدالخالق پروفیسر ہیں، اور ڈاکٹر فرزیر صدر، اس شعبے میں عربی اور اسلامیات کے کورس پڑھائے جاتے ہیں، میں وہاں "اسلام۔ انسانیت کے لئے ہدایت ہے" کے عنوان سے تقریر کرنے گیا تو حاضرین میں اساتذہ کے علاوہ بیس پچیس طلبہ اور طالبات کو موجود پایا، ان میں مصر سے آئی ہوئی ایک لڑکی (سُہیر) اور ایک یوگوسلاوی نوجوان (عبداللہ) بھی تھا، یہ دونوں پوسٹ گریجویٹ اسٹوڈنٹ تھے، اس شعبے میں عربی کی تعلیم کی مقبولیت بڑھتی جارہی ہے، بالخصوص مسلمان طلبہ اس کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں، غالباً آسٹریلیا کی نیشنل یونیورسٹی میں بھی ایک اسی قسم کا شعبہ قائم ہے، جو خاصا بڑا ہے،

ان دنوں مغربی تہذیب جس بحران کا شکار ہورہی ہے، اسے دیکھتے ہوئے اقبال کی پیشینگوئی کی صداقت ثابت ہوتی ہے، یورپ کو مخاطب کرکے شاعر مشرق نے کتنا صحیح کہا تھا،

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ آہو پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

یورپ اور امریکہ میں دولت کی فراوانی، مشینی زندگی کے سبب تن آسانی، سائنس و

ٹکنالوجی کے عروج اور تسخیر فطرت کے باوجود وہاں کا انسان کرب بے چینی میں سرگرداں نظر آتا ہے، فرار کی راہ تلاش کرنے میں وہ کبھی گانجا، چرس، حشیش اور دوسرے منشیات میں ڈوب کر اک گونہ بے خودی چاہتا ہے، یا جنسی کج روی میں مبتلا ہو کر تہذیب و اخلاق کی ساری قدروں سے بالکل بے نیاز ہو کر اپنی عافیت ڈھونڈتا ہے، کچھ لوگ اپنے درد کا مداوا نئے نئے روحانی تجربوں میں تلاش کرنے لگے ہیں، اس جستجو میں وہ کبھی آنند مارگ، اور کبھی کرشن بھگتی کی طرف مائل ہوتے ہیں کبھی بدھ مت یا چین فلسفہ کی جانب رُخ کرتے ہیں، جہاں کہیں بھی کوئی نئی، چونکا دینے والی آواز اٹھتی ہے، یہ لوگ اس سمت دوڑ پڑتے ہیں، مگر اس جستجو اور تگ و دو میں تلاش حق مقصود نہیں ہوتی، بلکہ انھیں ایسا آسان نسخہ حاصل کرنا مطلوب ہوتا ہے، جو فوراً اثر پذیر ہو اور جس سے اُن کے اضطراب میں قرار آجائے، مایوسی آس میں بدل جائے، زندگی بامعنی اور بامقصد ہوجائے، اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سے ہندوستانی معالج ہر طرح علاج کے دعوی کے ساتھ اپنے نسخے لے کر ان ملکوں میں پہنچے ہیں، اور اچھی خاصی تجارت شروع کر دی ہے، ان معالجوں میں یوگا سکھانے والے بھی کئی مرکز کھول چکے ہیں، اور خاصے مقبول ہیں، اُن کے اشتہار ٹی۔ وی، ریڈیو، اخباروں اور رسالوں میں دکھائی دیتے ہیں، مغرب میں چونکہ ہندوستان کی قدیم سرزمین پُر اسرار علوم کی سرزمین سمجھی جاتی ہے اس لئے لوگ بڑی بڑی فیس ادا کرکے یوگا سیکھنے جاتے ہیں،

عموماً جسمانی ورزش میں اعضاء اور نفس کا مختلف آسنوں کے ذریعے کنٹرول کرنا یوگا مانا جاتا ہے، اس کے ساتھ ہندو فلسفۂ زندگی اور روح کے تصور کو بھی دخل ہوتا ہے، مگر ان تجارتی قسم کے اداروں سے قطع نظر جو جلب منفعت کی خاطر قائم کئے گئے ہیں، میلبورن میں ایک ایسا ادارہ گذشتہ پندرہ سال سے قائم ہے، جو یوگا کو مذہب سے علاحدہ کرکے سائنس



کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، اس کے طریقۂ کار میں مراقبہ، نفس کشی، قوتِ ارادی کی افزائش، اور خدمت گذاری پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، اسی ادارے کی طرف سے مجھے آسٹریلیا کی دعوت موصول ہوئی تھی، میرے ذمے زیر تربیت مردوں اور عورتوں کی جماعتوں کو سوال و جواب یا مختصر بات چیت کے ذریعے، اخلاق، کردار اور معاملات کی باتیں، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بتانے کا کام تھا، میں اس مقصد کے لئے انھیں اسلام کے اصول کے علاوہ سیرۃ رسول اللہ، صحابۂ کرام، اور بزرگانِ دین کی زندگی سے ایسے حالات سناتا جو عمل صالح کے قریب لاسکیں، یہ عورتیں اور مرد جن کی عمریں تیس اور چالیس کے درمیان تھیں، جو ذہنی تناؤ، احساس گناہ، مستقبل کی طرف سے خوف اور مایوسی کی شکار ہو کر اب ان سے نجات پانا چاہتے تھے، میری باتیں بڑے غور سے سنتے، اور اثر قبول کرتے، جب ان کے سامنے اسلامی تاریخ سے اعلیٰ اخلاق، اور بلند کردار، نفس کے خلاف مجاہدہ کی مثالیں پیش کی جاتیں، تو اُن کے چہروں پر امید کی جھلک آجاتی، اور وہ مایوسی سے نکل کر یقین کی طرف جاتے ہوئے لگتے، انھیں شروع میں تصوف اور صوفیوں کے بارے میں جاننے کا بڑا شوق تھا کیونکہ وہ غالباً یہ سمجھتے تھے کہ یہ وہ راستہ ہے جس کے ذریعہ صرف وظیفہ اور ذکر کے ذریعے روحانیت کے اعلیٰ درجات حاصل ہوسکتے ہیں، میری جماعتوں میں بعض ایسے آسٹریلین بھی تھے جنھوں نے اسلام کا اچھا خاصا مطالعہ کیا تھا، انھوں نے مجھ سے بعض ایسی کتابوں کی نشان دہی چاہی جو انھیں مزید معلومات بہم پہنچا سکیں،

اس ادارے میں تربیت کے ایک ذریعہ خدمت گذاری کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس پہلو نے مجھے کافی متاثر کیا، ہر ممبر کو مختلف قسم کی خدمت سپرد کی جاتی ہے، اور روزمرہ کی زندگی میں بھی اسے داخل کرنے کی تربیت دی جاتی ہے، اس انداز عمل میں حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب کی تحریک کی وہ جھلک دکھائی دی جسے اکرام مسلم کا نام دیا گیا ہے، اور جس کے تحت آج بھی

تبلیغی جماعت کے ارکان دوروں پر نکلتے ہیں، تو خدمت کرنے کی خاطر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں، یوں تو آسٹریلیا بلکہ تمام مغربی ممالک میں اپنا کام خود کرنا خواہ معمولی ہو یا بڑا، ایک عام بات ہے، لیکن اس ادارے میں اس کا اطلاق اپنی ذات سے ہٹ کر دوسروں پر کیا جاتا ہے، میری جو مہمان نوازی ہوئی اس کا ایک پہلو یہ تھا، کہ ہر روز میری خدمت پر ایک ممبر نامزد کر دیا جاتا، یہ ممبر کبھی کوئی انجینیر ہوتا، کبھی کوئی وکیل اور کوئی لیکچرر وغیرہ" وہ مجھے ناشتہ اور کھانے کے لئے وقت پر اکر لے جاتے، (حالانکہ ڈائننگ ہال صرف ایک منزل نیچے تھا) میرا بستر درست کرتا، حتیٰ کہ میری بنیائن یا قمیص دھو کر لاتا، اور جوتوں پر پالش بھی کر دیتا، ایک روز میرے ایک رفیق نے (جو علم نفسیات کے ایم۔ اے تھے) تجویز پیش کی، کہ ہم ایک پارک کی سیر کو جائیں، پیروں کی تکلیف کے سبب میں زیادہ چلنے سے معذور تھا، اس کا لحاظ کرتے ہوئے انھوں نے پہیوں والی ایک کرسی موڑ کر موٹر میں رکھ لی، اور پارک پہنچ کر مجھ کو باصرار اس پر بیٹھنے کو کہا، وہ خود اُسے ڈھکیل کر مجھے پارک کی سیر کراتے رہے،

یہ لوگ آپس میں روزمرہ بھی ایک دوسرے کی خدمت کرنے پر مستعد رہتے ہیں، ڈائننگ ہال میں کسی کی پلیٹ خالی ہوئی تو دوسرا اسے اٹھالے جائیگا، کسی کے لئے چائے لائے گا، ہر شخص اپنا کھانا کچن سے خود لاتا، مگر مجھے میز پر بیٹھا دیکھتے ہی فوراً ہی کوئی ایک اٹھکر میرے لئے پلیٹ میں جو کھانا مجھے چاہئے لے آتا،

میں جب ان لوگوں کو دیکھتا تو دل میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ تربیت کا یہ اثر کس حد تک دیرپا ثابت ہوگا؟ پھر میں نے سوچا کہ اگر پچھلے دس پندرہ سال سے اس ادارے کے ساٹھ ارکان اپنے ادارے سے اس حد تک مخلصانہ طور پر وابستہ رہے ہیں، تو یقیناً ان کی قلب ماہیت ہو چکی ہوگی، اور ان کے دل نئے سانچے میں ڈھل چکے ہوں گے،



# وفیات

## جناب بشیر احمد ڈار مرحوم

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

۲۹ مارچ ۱۹۷۹ء کو پاکستان کے ممتاز، لائق اور مشہور اہلِ قلم جناب بشیر احمد ڈار اللہ کو پیارے ہوئے، ان کی وفات کی خبر دیر سے ملی، دکھ ہوا، کہ پاکستان ایک بہت اچھے مصنف، بہت اچھے فلسفی اور بہت اچھے انسان سے محروم ہوگیا۔

۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۸ء تک پاکستان بار بار جانے کا اتفاق ہوا، تو جناب بشیر احمد ڈار سے کراچی، اسلام آباد اور لاہور میں برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، پہلی بار جناب سید حسام الدین راشدی کے دولت کدہ پر ملا، جو کراچی کے ارباب علم و دانش کا صنم خانہ بنا ہوا ہے، معارف کے صفحات پر جناب سید حسام الدین راشدی کا ذکر خیر اکثر آیا ہے، میری نظر میں وہ پاکستان کے پرنس اسکالر ہیں، ان گنت کتابوں کے مایہ ناز مصنف ہیں، اللہ تعالےٰ نے دولت بھی دی ہے، اس لئے علم دوست اور علم نواز بن کر اپنی مرصع کوٹھی پر علمی محفلیں بھی سجاتے رہتے ہیں، جن میں شریک ہو کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جہانگیر کے دور میں سندھ میں غازی خان ترخان کے یہاں بھی ایسی ہی پرکیف مجلسیں ہوا کرتی ہونگی، ان محفلوں میں جناب

بشیر احمد ڈار کا ہونا لازمی تھا۔ جو کراچی میں راشدی صاحب کی زندگی کے جزو لاینفک بنے رہے، شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا جب دونوں کی ملاقاتیں نہ ہوتیں، دونوں کی ملاقاتوں میں پروفیسر شیخ عبدالرشید بھی (سابق استاد تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) ضرور شریک ہوتے، پھر یہ تینوں حضرات علم و فن کے تھری مسکیٹیرز بن جاتے، کبھی بار مجھ کو بھی ان کی دلچسپ صحبت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا، راشدی صاحب کی ہر بات کا برجستہ جواب دینے کے لئے پروفیسر شیخ عبدالرشید تیار رہتے، دونوں کی علمی پھلجھڑیوں اور پٹاخوں سے جناب بشیر احمد ڈار محظوظ تو ہوتے، مگر زیادہ تر خاموش ہی رہتے، ان دونوں کی باتوں کی داد صرف اپنی خوشگوار ہنسی کی، پریم تبسمی کھول کر دیتے، اور جب بولتے تو سونا پگھلاتے ہی نظر آتے، اہل علم کی کچھ قسمیں ایسی ہیں جن کے اندر علم و فن کا خزانہ بھرا رہتا ہے، مگر ان کو دبا کر رکھنے ہی میں اپنی بلندی تصور کرتے ہیں، بشیر احمد ڈار صاحب کے ساغر میں علم و فن کی مے بھری رہتی، مگر اس کو ہر جگہ چھلکتے ہوئے دیکھنا پسند نہ کرتے، وہ دوسروں کی گفتگو دن سے لطف لیتے، مگر خودشناسی سے بے نیاز ہو کر اپنی علمی خودی کی بے خودی سے دب کر خاموش بیٹھے ہی رہنا پسند کرتے۔

وہ نسلاً کشمیری تھے، مگر ان کا خاندان لاہور میں آباد ہو گیا تھا، یہیں وہ ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے، پہلی دفعہ ان سے ملاقات ہوئی تو چھڑی ٹیک کر کچھ لنگ کھاتے ہوئے چلتے دیکھا، معلوم ہوا کہ بچپن میں اپنے مکان کی چھت پر پتنگ اڑا رہے تھے، اس پر سے گرے، تو ایک ٹانگ اس طرح مجروح ہوئی کہ اس کو قطع ہی کر دینا پڑا۔ گھر کے لوگ ان کی زندگی کے اچھے مستقبل سے زیادہ پُر امید نہیں تھے، مگر انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم۔ اے۔ کیا، پھر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں آکر بی۔ ٹی کی



ڈگری حاصل کی، لاہور کی انجمن حمایت اسلام کے اسکولوں میں ملازمت کر کے ایک شفیق اور لایق استاد کی حیثیت سے مشہور ہوئے، یہاں کے قیام میں ان کو اقبالیات سے بڑی دلچسپی ہوئی، ۱۹۴۴ء میں ان کی کتاب انگریزی میں "اے اسٹڈی ان اقبالس فلوسفی" کے نام سے شایع ہوئی، اس میں ان کا یہ مطمح نظر تھا کہ اسلام ہندوستان میں آیا تو یہاں اس کی اخلاقی اور معاشرتی تعلیمات اصلی طور پر عمل میں نہیں آئیں، کچھ مصلحوں اور صوفیوں نے وحدت الوجود کے ذریعہ سے ہندو مذہب اور اسلام کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی، اکبر نے دین الٰہی قائم کر کے مذہب کو حکومت کی سرپرستی میں لیا، تو یہ پہلی اور آخری سعی ہو کر رہ گئی، دارا شکوہ کی وجہ سے اس ملک کی ایک بڑی آبادی اخلاقی اور ذہنی فالج میں خطرناک حد تک مبتلا ہونے والی تھی، مگر اس کے خاتمہ سے اس قسم کی تحریک ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی، ایسی تحریکوں کے خلاف حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی تحریکیں چلائیں ۱۸۵۷ء کے بعد......... مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت کو دور کرنے کی کوشش برابر جاری رہی، اس بار کو اقبال نے بھی اپنے کاندھوں پر اٹھایا جو موجودہ دور کی مادی ترقی سے بددل تھے، ان کو خیال ہوا کہ اگر قرآن مجید کی تعلیمات پر صحیح طور سے عمل کیا جائے، تو نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کو حیات نو مل جائیگی، اور جب یہی بات ان کی جادو بھری شاعری کے ذریعہ سے مسلمانوں کے کانوں تک پہونچی تو ان کو احساس ہوا کہ زندگی کے تخیلات کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں از سر نو ترتیب دیا جا سکتا ہے، ۱۹۴۴ء سے پہلے بھی یہ باتیں کہی گئی تھیں، مگر بشیر احمد ڈار صاحب نے ان کو کچھ ایسے طاقتور اور موثر انداز میں اپنی اس کتاب میں پیش کیا کہ ممتاز ارباب علم کی نظر ان کی طرف اٹھی، انھوں نے اس کو مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے نام سے معنون کیا جس سے ظاہر ہے کہ وہ ان سے بھی متاثر تھے،

اس کتاب کی اشاعت کے بعد وہ مجلۂ اقبال کے نائب مدیر بنائے گئے، جس کے مدیر
اس وقت اس برصغیر کے مشہور فلسفی ایم۔ ایم۔ شریف صاحب تھے، پھر وہ اقبال اکیڈمی کے
ڈائرکٹر کے عہدہ پر مامور ہوئے، جو ان کی علمی قابلیت کا بہت بڑا اعتراف تھا، وہ اس عہدہ پر
غالباً ۱۹۷۱ء تک رہے، وہ پاکستان کے فلاسفیکل جرنل کے مینجنگ اڈیٹر بھی آخر وقت
تک تھے، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور کے ترجمان ثقافت کے ادارۂ تحریر کے بھی رکن تھے
۱۹۷۵ء میں کراچی میں ان سے ملنے ان کے گھر گیا تو انھوں نے اپنی دو کتابیں "اقبال
اینڈ پوسٹ کانٹین وولنٹرزم" اور "ریلیجس تھاٹ آف سید احمد خان" نذر کیں، جن کو بار
بار پڑھنے کا اتفاق ہوا، اول الذکر کتاب بزم اقبال کی طرف سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی،
پانچ سو چھیالیس صفحے پر مشتمل ہے، اس کی انگریزی تحریر میں جو روانی، سنجیدگی اور وقار ہے
اس کو پڑھ کر یہ اثر ہوتا ہے کہ یہ لاہور کے کسی کالج کے فارغ التحصیل کے بجائے انگلستان
کی کسی بلند پایہ یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگریوں کے پانے والے نے لکھی ہے، اس کے لائق مصنف
نے کانٹ کے فلسفۂ استدلال اور قوت ارادی، نٹشے کی فکر خودآگاہی، شوپنہار کے
تخیل فکر، اور قلبی معلومات، ملٹن کے نظریۂ شیطنت، برگسان کے تخیل عشق، گیٹے کی
روشن خیالی، جیمس وارڈ کے فلسفہ پر سائنٹفک اثرات، عقلیت اور میکانزم کے خلاف
میک ڈوگل کے خیالات، ولیم جیمس کے نظریۂ عملیت اور اس کے چارٹزم، برڈننگ کی
نیچر نوازی اور برنارڈ شا کی قوت ارادی پر جس طرح بحث کی ہے، اس پر ایک
انگریز فلسفی کو بھی رشک آسکتا ہے، یورپ کے ان فلسفیوں کا گہرا مطالعہ کرنے
کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اقبال کے سامنے ان مغربی مفکروں کے خیالات
ضرور رہے، مگر ان کے ان ہی افکار کو قبول کرنے کے لئے تیار رہے جو قرآن مجید اور



گذشتہ اسلامی مفکرین کی تعلیمات کے مطابق تھیں،

جناب بشیر احمد ڈار اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ اقبال کی فکری اور نظری تنظیم
ملے جلے اجزا سے بنی جن کے کچھ حصے کبھی ایک اور کبھی دوسرے مغربی مفکرین سے مستعار لئے گئے،
ان کی فلسفیانہ موشگافیاں بظاہر مغربی مفکرین کی معلوم ہوتی ہیں، لیکن یہ دراصل وہی ہیں
جو اسلام کے بنیادی عقاید پر مبنی مسلمان مفکروں کے یہاں بھی گذشتہ دور میں پائی
گئی ہیں، اقبال کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے موجودہ دور کے علم وفضل کی ترقی سے فائدہ
اٹھا کر ان کو جدید منطقیانہ رنگ اور سریع الفہم انداز میں ترتیب دیدیا ہے، بشیر احمد ڈار
صاحب نے اپنی اس کتاب میں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ذہن جب
قدامت پسندی اور ترقی پسندی کے جھولے میں جھول رہا تھا، تو اقبال نے ان دونوں
کے اچھے پہلوؤں کو ملا کر اپنے افکار کے عناصر مرتب کئے، جن کا سرچشمہ سراسر قرآن مجید ہی رہا،
جس طرح ابن تیمیہ نے قرآن پاک کی تعلیمات سے اسلام کو ایک نئی زندگی عطا کی، اسیطرح
اقبال کا یہ پیام ہے،

چون کہن گردد جہانے در برش     می دہد قرآن جہانے دیگرش

بشیر احمد ڈار صاحب نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید ان لوگوں سے
بھی ہوگی، جو اقبال کا گہرا مطالعہ کریں گے، ڈار صاحب نے جس فلسفیانہ اور فاضلانہ
انداز میں اس کی وضاحت کی ہے، اس سے لوگ آیندہ بھی برابر مستفید ہوتے رہیں گے،
خود انھوں نے قرآن مجید کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے انگریزی میں "قرآنی اخلاقیات" کے
نام سے ایک کتاب بھی لکھی، وہ اس کے بھی قائل تھے کہ اقبال کا نظریۂ ارتقاء قرآن مجید
کی تعلیمات ہی پر مبنی ہے، گو انھوں نے ابن مسکویہ مولانا رومی اور شاہ ولی اللہ کے افکار سے بھی

مدد لی ہے، ان کا یہ تصور ڈارون اور برگسان کے نظریے سے بالکل مختلف ہے، انھوں نے اس خیال پر پورا زور اپنے خطبۂ صدارت میں دیا جو انھوں نے اپریل ۱۹۷۰ء میں پاکستان فلاسفیکل کانگریس کے اجلاس میں پڑھا۔

ان کو اقبالیات سے کچھ ایسا لگاؤ تھا کہ انھوں نے اقبال کی مثنوی گلشن راز جدید، بندگی نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق اور قوم کے نوجوانوں کو پیغام کے انگریزی ترجمے بھی کیے، اور ان میں سے بعض پر حواشی بھی لکھے، اقبال کے انگریزی اور اردو خطوط کے مجموعے بھی مرتب کیے۔

اقبالیات کے چمن میں نرگس اپنی بے نوری پر نہیں روے گی، جہاں اس میں اور دیدہ ور پیدا ہوئے، وہاں بشیر احمد ڈار صاحب نے اپنی دیدہ وری سے اقبال کا جو اصلی اور حقیقی مقام متعین کیا ہے، وہ اقبالیات کی تاریخ میں برابر یاد کیا جائے گا۔

ان کی تصنیف "ریلیجس تھاٹ اف سید احمد خان" پر یہ راقم جنوری ۱۹۷۶ء کے معارف میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہے یہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کے ذریعہ سے انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستانی مسلمان اپنے حکمران انگریزوں اور اپنے ہموطن ہندوؤں کے ساتھ رہ کر جس ذہنی، تمدنی اور مذہبی آزمایش میں مبتلا ہوئے، اس کا اس میں اچھا تجزیہ ہے، عیسائی مبلغین اسلام پر طرح طرح سے حملے کر رہے تھے، جن سے مسلمانوں میں احساسِ کمتری پیدا ہو رہا تھا، پھر ہندوؤں نے انگریزی تعلیم پا کر بدلے ہوئے حالات میں ہر قسم کے اقتصادی فوائد حاصل کر کے اپنے مذہب میں بھی اصلاحات شروع کر دی تھیں، مسلمانوں کو دونوں سے مقابلہ کرنا تھا، اسی کے ساتھ وہ ذہنی طور پر اپنے سو بھی برسرپیکار تھے، وہ ماڈرنزم سے بھی متاثر ہو رہے تھے، مگر اپنی مذہبی روایات سے کنارہ کش بھی



ہونا نہیں چاہتے تھے، وہ اپنے مذہب کی فرمانروائی کے خواہاں بھی تھے، اسی کے ساتھ ان کو سائنس، فلسفہ اور عقلیاتی علوم سے اپنے مذہبی عقائد کی تطبیق کی جستجو بھی تھی، وہ اپنے قدیم خیالات کے علماء کو نظر انداز کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، لیکن ان کی ہر بات کو تسلیم کر کے اپنے تمام مسائل کا حل بھی نہیں پاتے تھے، وہ تجدد پسند مصلحین کے مغربی افکار کی باتوں کو بھی شوق سے سنتے، مگر غیر شعوری طور پر ڈرتے بھی رہتے کہ کہیں ان کی باتوں کو قبول کر کے اپنی مذہبی روایات سے دور نہ ہو جائیں، اس ذہنی آویزش کی فضا میں سید احمد خان کی تحریک چلی تو ایک بڑا طبقہ ان کی طرف جھک گیا، جن کے خیالات میں اس کو بہت کچھ ذہنی سکون ملا، سید احمد خان نے اسلامی تعلیمات کی جو جراتمندانہ تعبیریں کیں، ان کا جائزہ بشیر احمد ڈار صاحب نے اپنی اس کتاب میں لیا ہے، وہ ان سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں کہ اب جب مغربی تمدن کی وجہ سے مادی رجحانات پیدا ہو رہے ہیں، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سید احمد خان نے جو اسلام پیش کیا تھا، اس کو سمجھ کر ایک موثر ذریعہ بنانے کی ضرورت ہے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن کے نام سے جو تفسیر لکھی ہے، اس میں وہی سب کچھ ہے، جو سید احمد خاں نے پیش کیا تھا، بلکہ اقبال اپنے فلسفیانہ خیالات کے باوجود قرآن مجید کے بعض نکات کے اور اک میں سید احمد خان سے آگے نہیں جا سکے ہیں،

ڈار صاحب اپنی اس کتاب میں دراصل جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اس کرب اور اضطراب کے ترجمان بن گئے ہیں، جو ماڈرنزم تو چاہتے ہیں، مگر اپنے مذہبی عقائد سے ہٹ کر ماڈرنزم میں اپنی ذہنی پریشانیوں کا حل نہیں پاتے ہیں: اب سوال یہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد کا ساتھ ماڈرنزم ساتھ کس طرح دیں، کیا ہر جگہ اور ہر زمانہ میں

سید احمد خان پیدا ہونے کی ضرورت ہے، مگر ایسے سید احمد خان کی بھی ضرورت نہیں جن کے خلاف قدیم خیالات کے علماء کی جماعت کھڑی ہو جائے، پھر ایسے علماء اگر واقعی اسلام کے نگہبان اور پشتیبان ہیں تو ان کو ایسے سید احمد خان کو گوارا کر لینے میں تامل نہ ہونا چاہئے، جو اپنے خالص اسلامی جذبہ سے اسلام کو ماڈرنزم اور ماڈرنزم کو اسلام سے ہم آہنگ کر دے، اسلام ایک دائمی اور عالمگیر مذہب ہے، ہر زمانہ، ہر ماحول اور ہر ملک کے لئے ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طور پر سمجھ کر متکلمانہ اور مخلصانہ انداز میں پیش کیا جائے،

بشیر احمد ڈار صاحب متکلم اسلام تو نہیں تھے، مگر فلسفیانہ انداز میں اسلام کا درد رکھتے تھے، انھوں نے اسی درد کا اظہار بڑے کرب اور بے چینی کے ساتھ کیا ہے، سید احمد خان کے خیالات میں ان کا پناہ لینا اگر صحیح نہیں تھا تو پھر ان کے ہم خیال اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو مطمئن کون کر سکتا ہے؟ ان کی ذمہ داری تو ان پر آتی ہے، جو اپنے کو صحیح معنوں میں اسلام کا نگران اور محافظ سمجھتے ہیں، ڈار صاحب اپنی اس کتاب سے بھی ان پر یہ ذمہ داری عائد کر گئے ہیں۔

جناب بشیر احمد ڈار کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گذرتا، اقبالیات کے علاوہ تاریخ تصوف قبل از اسلام، حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق اور پاکستان کیوں؟ وغیرہ اپنی علمی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں، آخر میں تصوف کی فارسی کتاب ثمرات القدس بھی ترتیب دے رہے تھے، پھر رسالوں اور کانفرنسوں، انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی اور ورلڈ آف فلاسفی کے لیے برابر مضامین لکھتے رہے۔

ان کی خود شکن بھلمنساہت کا ایک واقعہ برابر یاد آتا ہے، دسمبر ۱۹۷۷ء میں



لاہور میں علامہ محمد اقبال کے صد سالہ جشن کے موقع پر ہم لوگ انٹر کونٹی نینٹل ہوٹل میں ایک ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے، وہیں جناب سید حسام الدین راشدی پر قلب کا حملہ ہوا وہ اسپتال منتقل کر دیے گئے، دوسرے دن میں ان کی عیادت کے لئے اسپتال جانا چاہتا تھا، جناب بشیر احمد ڈار اپنی محبت میں میری رہبری کے لئے تیار ہو گئے، جشن کے مہمانوں کو لاہور کے تاریخی مقامات کی سیر کرانے کے لئے مخصوص بسیں اور موٹریں چلیں، ہم دونوں بھی روانہ ہوئے، طے ہوا کہ لاہور کے شاہی قلعہ سے ہم دونوں اسپتال چلے جائیں گے، وہاں پہونچے تو اسپتال جانے کے لئے کوئی ٹیکسی نہیں ملی، جشن کی موٹروں کے انچارج ڈار صاحب کے ایک شاگرد رشید تھے، ڈار صاحب ان کو کہتے کیا بلکہ حکم دیتے تو وہ بہت شوق سے ہم دونوں کو اسپتال پہونچا دیتے، مگر انھوں نے کہا کہ اتنی سی بات کے لیے احسان کیوں لیا جائے، اور وہ تانگے پر چلنے کو تیار ہوئے، ان کے شاگرد رشید نے ہم دونوں کو تانگے پر بیٹھتے دیکھا تو وہ ایک اچھی موٹر لے کر پہونچ گئے کہ یہ حاضر ہے، جب تک چاہیں، اس کو استعمال میں رکھیں، معلوم نہیں ڈار صاحب کی ایسی بے نیازی کی مثالیں انکی زندگی میں کتنی ملینگی،

وہ اپنی تصانیف کو تو علمی دنیا میں چھوڑ گئے، مگر وہ سفر آخرت کے لیے بھی زاد راہ لے گئے ہیں، اجتہاد کے ذریعہ سے وہ اسلام کی سربلندی اور اعتدال پسندی کے خواہاں تھے، وہ قرآن مجید کی اخلاقی تعلیمات کی بھی ترویج چاہتے تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی نیکی اور بھلمنساہت کے ساتھ جو تحریریں لکھیں کیا عجب کہ خداوند قدوس کی بارگاہ میں مغفرت کا باعث بن جائیں، آمین۔

.....

# جوان مرگ محمد الحسنی

از۔ عبد السلام قدوائی

جون کا معارف طباعت کے آخری مرحلہ میں تھا کہ اچانک اطلاع ملی کہ ندوۃ العلماء کے نقیب رسالہ البعث الاسلامی کے مدیر مولوی محمد الحسنی کا انتقال ہوگیا، یہ خبر اتنی خلاف توقع تھی کہ بڑی دیر تک یقین نہیں آیا، ان کی عمر زیادہ نہیں تھی، چالیس سے تین ہی چار سال آگے بڑھے ہوں گے، صحت بھی اچھی تھی، کبھی کسی طویل یا شدید بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے تھے، جب ملاقات ہوتی ہشاش بشاش نظر آتے۔

یہ سچ ہے کہ جو آیا ہے، اسے ایک دن جانا ضرور ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت، لیکن کسے معلوم تھا کہ ان کا وقت موعود اتنا قریب ہے، ہم لوگوں کے سامنے تو بچے تھے، ان کی پیدائش کل کی بات معلوم ہوتی ہے، ہم کس طرح خیال کرتے تھے کہ وہ ہم سے پہلے رخت سفر باندھ لیں گے۔ لیکن ان کے دوستوں اور ہم سنوں کو بھی اس تیز روی کا گمان نہیں تھا، ان کی جسمانی ساخت اور صحت کی رفتار دیکھ کر سبھی عمر طویل کی پیشین گوئی کرتے تھے، لیکن ظاہر بینوں کے یہ سارے اندازے غلط ثابت ہوئے اور اللہ کی مشیت پوری ہو کر رہی، تقدیر کے سامنے تدبیر نے سپر ڈال دی، اور انسان کی مجبوری وبے بسی ہی نہیں خام خیالی اور غلط اندیشی بھی نمایاں ہوگئی۔



مصلحت ایزدی تھی کہ وہ چھوٹی عمر ہی میں اس دنیا سے کوچ کر جائیں تقدیر الٰہی کے راز ہائے سربستہ کی نقاب کشائی انسان کے بس میں نہیں ہے، اس کا علم ناقص اس کی نظر کوتاہ اور اس کا علم محدود ہے، ان حالات میں وہ حکمت الٰہی کا احاطہ کس طرح کر سکتا ہے، عالم غیب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، ہم ظاہر بین باطن کے حقائق سے ناواقف ہیں، البتہ اللہ کی مصلحت پر ہمارا ایمان ہے، اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس کا کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں ہے، یہ ہماری کم نگاہی ہے کہ موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں، اس سے تو حیات نو کا آغاز ہوتا ہے، دنیا مطیۃ الآخرہ ہے، انسان اس جہان فانی سے گزر کر عالم جاودانی میں قدم رکھتا ہے، جہاں اسے مادہ کے جامۂ تنگ کو اتار کر خلعت لامحدود عطا ہوتی ہے، اور فنا کے گھاٹ سے اتر کر بقائے دوام نصیب ہوتا ہے، اسے انحطاط و زوال کے خوف سے نجات ملتی ہے، اور عروج مسلسل اور ارتقائے پیہم کی مسرت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔

محمد میاں اب ہمیں نظر نہیں آتے ہیں، لیکن یہ ہماری نظر کی کوتاہی اور نگاہ کی نارسی ہے، اگر مادیت کا حجاب حائل نہ ہوتا تو ہم دیکھتے کہ وہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون[1] کے عالم میں پہونچ کر فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ[2] کے زمرہ میں شامل ہوگئے ہیں، وہاں نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ[3] کے مزے لے رہے ہیں، اور پس ماندگان کو خوف وحزن سے نجات کی بشارت سنا رہے ہیں، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم اللہ کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے، وہ جسے جو چاہے دے، وہ سمیع وبصیر علیم وخبیر ہے، وہ دلوں کی آواز سنتا اور نیتوں کے

---

۱؎ نہ ان کو خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے ۲؎ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں جو عطا کیا اس پر خوش ہیں ۳؎ غفور رحیم کی طرف سے مہمانی۔

خلوص کو دیکھتا ہے، وہ ماضی سے آگاہ، حال سے باخبر اور مستقبل سے واقف ہے، اس کے یہاں مزد پابند وقت نہیں، بلکہ مزدور کے حسن عمل اور صلاحیت کار پر موقوف ہے، کسی کو سارے دن کی جانکاہی کے بعد چند پیسے ملتے ہیں، اور کسی کو صرف چند منٹ کی کارگذاری پر اشرفیاں عطا ہوتی ہیں، قلت و کثرت کا فیصلہ مالک کی نظر پر منحصر ہے، اس کو کسی کا کام پسند آجائے تو تھیلیوں کے منہ کھول دیتا ہے،

محمد میاں نے عمر بہت کم پائی اس زندگی کی چوبیس بہاریں بھی پورے طور پر دیکھ نہ پائے کہ مادی آنکھیں بند ہوگئیں، اور روح فنا کے مرحلہ سے گزر کر بقا کی منزل میں پہنچ گئی، وہ ڈاکٹر عبد العلی مرحوم کی آخری اولاد تھے، پانچ بیٹیوں کے بعد اللہ نے انھیں یہ بیٹا عطا کیا تھا، سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، ڈاکٹر صاحب بھی مسرور ہوئے، انھوں نے اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کیا، اور طے کر لیا کہ اس عطیۂ ربانی کو اسی کی راہ میں لگائیں گے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی طرح دینی و دنیاوی تعلیم دلا کر اس بچے کو ڈاکٹر بنائیں گے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے سوچنے کا انداز دوسرا تھا، وہ اللہ کے دین اور اس کے .. بندوں کی خدمت کے قائل ضرور تھے، مگر موقع و محل حالات و ضروریات کے پیش نظر وہ خدمت کی نوعیت اور دائرۂ کار کا تعین کرتے تھے، محض مادی نفع تو کبھی ان کا مطمح نظر نہیں رہا۔ وہ خالص دنیاوی کاموں میں بھی روحانی قدروں کو پیش نظر رکھتے تھے، اور رضائے الٰہی کی طلب سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے، مگر اس بارہ میں بھی وہ ادنیٰ و اعلیٰ پر نظر رکھتے تھے. انھوں نے محمد میاں کی تعلیم و تربیت میں بھی یہ نقطۂ نظر پیش نظر رکھا، وہ نصاب و نظام تعلیم کے بارہ میں تقلید کے بجائے اجتہاد کے قائل تھے، اور خوب سے خوب تر کی فکر میں رہتے تھے، پہلا تجربہ



انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی (علی میاں) پر کیا، پھر اسی روشنی میں محمد میاں کے لیے بھی نصاب و طرز تعلیم کا ایک موثر اور تیز رفتار لائحۂ عمل مرتب کیا، مجھے یاد ہے کہ تجربہ کار مدرسین اس پر سخت تنقید کرتے تھے، اور وثوق کے ساتھ اس کی ناکامی کی پیشین گوئی کرتے تھے، مگر ڈاکٹر صاحب اپنی رائے پر جمے رہے، بالآخر ان کی رائے صحیح ثابت ہوئی، اور محمد میاں قواعد و ضوابط کی پُرپیچ راہوں سے گزرے بغیر ادب و انشاء کی ایسی بلند منزل تک پہونچ گئے، جس پر لوگ رشک کرتے تھے، ان کی تحریریں فصاحت و بلاغت، زور کلام، قوت استدلال اور انداز بیان کا بہترین نمونہ ہوتی تھیں، ان کے مضامین عرب ملکوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے اور دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے، وہ مقرر نہ تھے، مگر جب کبھی مجمع کے سامنے کوئی مضمون پڑھتے تو سامعین ہمہ تن گوش ہوجاتے۔

اللہ نے ان کے دل کو اسلام کی محبت اور ملت کے درد سے سرشار کر دیا تھا، باپ کی تربیت اور صاحبان علم و بصیرت کے فیضان نظر نے اس نشہ کو دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بنا دیا تھا، ابھی شعور کی آنکھیں ٹھیک سے کھلنے بھی نہیں پائی تھیں کہ وہ اسلام کی خدمت اور ملت کی تنظیم کے خواب دیکھنے لگے، اس غرض سے ایک سوسائٹی کی تشکیل کی اور اسلام کی بین الاقوامی زبان عربی میں ایک اعلیٰ درجہ کے رسالہ کے اجرا کا منصوبہ بنایا، ان کے حسن نیت نے اس خیال کو مقبولیت عطا فرمائی اور البعث الاسلامی کے نام سے ایک وقیع رسالہ جاری ہوگیا، اور ملل اسلامیہ کے درمیان ربط و نظم کی طرح پڑ گئی جس نے آگے چل کر ایک موثر اور مضبوط نظام کی شکل اختیار کی، ندوۃ الشباب العالمیۃ اور رابطۃ العالم الاسلامی دونوں ان کے خواب کی تعبیر ہیں، ان کے قلم کا اثر روز بروز بڑھ رہا تھا، اور مصر و شام، نجد و حجاز اور دوسرے عرب ممالک میں ان کے

مضامین بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے، ان کا ایک مجموعہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے، مزید کتابیں زیر ترتیب تھیں، لیکن ع آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

عربی کے ساتھ وہ اردو کے بھی بہت اچھے انشا پرداز تھے، اس کم عمری میں انھوں نے کہنہ سال مصنفین سے خراج تحسین وصول کیا، مولانا محمد علی مونگیری کی ضخیم سوانح عمری کے علاوہ تصانیف و تراجم کا ایک سلسلہ یادگار ہے، مشہور صاحب علم جرمن مسلمان لیوپولڈ اسد کی کتاب "روڈ ٹو مکہ" کا ترجمہ "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے ایسا رواں اور شستہ کیا کہ اہل زبان عش عش کرنے لگے، مولانا ابوالحسن علی کی تحریروں کے بڑے باکمال مترجم تھے، ان کی بہت سی کتابوں اور رسالوں کو عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں منتقل کیا ہے، اور ابھی چند ماہ ہوئے ان کی ضخیم سیرت نبوی کا ترجمہ اس خوبی کے ساتھ اردو میں کیا کہ اصل کا گمان ہوتا ہے، علی میاں ان کی ترجمہ نگاری کے بڑے مداح تھے، اور کہا کرتے تھے کہ محمد میاں نقل کو اصل بنا دیتے ہیں۔

علم و ادب میں اس کمال کے ساتھ وہ تہذیب و شائستگی اور شرافت و متانت کا بھی بہترین نمونہ تھے، خوردوں کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آتے، دوستوں کی دلداری و دلنوازی کی کوشش کرتے، بزرگوں کی تعظیم و توقیر کا ہمہ وقت خیال رکھتے اور ہم نشینوں کی خوشنودی کی فکر کرتے، اجنبی آدمی سے بھی ملاقات ہوتی تو مسکراتے ہوئے ملتے، ان کے چہرہ کی بشاشت اور خندہ جبینی ان کی لطافت طبع اور پاکیزگی قلب کی ترجمان تھی، انکی کس کس بات کو یاد کیا جائے۔ ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

جی چاہتا تھا کہ ابھی کچھ دن اور زندہ رہتے، اپنے بچوں کی بہار دیکھتے، گھر والے



ان کو دیکھ کر خوش ہوتے، عزیز ان کے حسن سلوک سے مستفید اور دوست انکی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی سے محظوظ ہوتے، اور ان کے دل ان کی باغ و بہار طبیعت سے باغ باغ ہوتے، ملک و ملت کی خدمت کے نئے نئے میدان تلاش کرتے، ان کا اشہب قلم نئی وادیوں میں قدم رکھتا، اس کی جولانیاں نئے معرکے سر کرتیں، اور وہ اپنی سحر آفریں تحریروں سے دلوں کو مسخر کرتے لیکن۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مشیت ایزدی کے سامنے کسے مجال دم زدن ہے بندگی تسلیم و رضا کی طالب ہے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

## ایک اور سانحہ

# محمد اسحٰق جلیس مرحوم

ابھی یہ سطور زیر تحریر ہی تھیں کہ مولوی محمد اسحٰق جلیس ندوی کے انتقال کی اطلاع ملی وہ ندوہ کے کتب خانہ کے نائب مہتمم، رسالۂ تعمیر حیات کے ایڈیٹر اور تحریک پیام انسانیت کے سرگرم سکریٹری تھے، مولانا ابوالحسن علی ندوی ان کے بڑے قدرشناس تھے، اور ان سے بڑی توقعات رکھتے تھے، افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور عین شباب کے عالم میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے نوازے، پس ماندگان کو صبر عطا فرمائے اور ندوہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

# غالبؔ: مدح و قدح کی روشنی میں

## مولانا سعید احمد اکبرآبادی

## کا

## ایک مکتوب

دارالمصنفین کی روایت رہی ہے کہ جب اس کی نئی مطبوعات شائع ہوتی ہیں، تو ریویو کے لئے بہت کم جگہیں بھیجی جاتی ہیں، مگر مولانا سعید احمد اکبرآبادی اڈیٹر برہان کے پاس خاص طور پر ارسال کی جاتی ہیں، غالبؔ پر مذکورۂ بالا کتاب شائع ہوئی تو اُن کے پاس روایت کے مطابق بھیجی گئی، اس کی پہلی جلد پر انھوں نے جو تبصرہ کیا اُس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:۔

"غالبؔ صدی تقریبات کے سلسلے میں مرزا غالبؔ پر چھوٹی بڑی، اچھی بری سیکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں غالبؔ کی زندگی اور اس کے فن کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جو زیر بحث نہ آگیا ہو، اس لئے سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے جب ان تقریبات میں شرکت کا ارادہ کیا، تو اپنے لئے مندرجۂ بالا عنوان منتخب کیا، جو ایک حد تک ان سب کا جامع ہے، جو اب تک غالبؔ پر مدح یا قدح میں لکھا گیا تھا، چنانچہ زیر تبصرہ کتاب میں جو صرف حصہ اول ہے، غالبؔ کے معاصرین اور اُن کے شاگردوں سے لے کر ڈاکٹر عبداللطیف تک تمام لوگوں کی تحریری آراء کو جن میں غالبؔ کی نسبت



اظہار خیال کیا گیا ہے، یک جا کر دیا گیا ہے، اس بنا پر اس کتاب کا یہی فائدہ کچھ کم نہیں ہے، کہ یہ بہت سی کتابیں پڑھنے سے بے نیاز کر دیتی ہے، مزید برآں لائق مولف نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان تحریروں پر تبصرہ بھی کرتے گئے ہیں، اس چیز نے کتاب کی افادیت کو دوچند کر دیا ہے، کتاب بڑے سلیقے اور عمدگی سے مرتب کی گئی ہے، انداز بیان دلکش اور لطف آفریں ہے، غالب اور غالبیات کے طالب علم اور اساتذہ کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔"

(مارچ ۱۹۷۹ء)

اس کتاب کی دوسری جلد پر مولانا نے تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا:۔

"......اس دوسرے حصہ میں جن ادیبوں اور نقادوں کی تحریروں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے ان کی مجموعی تعداد چھتیس ہے، جن میں مشہور اور بلند پایہ حضرات ہیں،......ان پر جو تبصرے ہیں، وہ بڑے دلچسپ اور فکر انگیز ہیں، علی الخصوص شیخ اکرام، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، نیاز فتح پوری اور شوکت سبزواری پر انھوں نے جو تبصرے کئے، اور ہلکی ہلکی جو چٹکیاں لی ہیں، وہ بڑی معنی خیز ہیں، اور ادب کا ایک نمونہ بھی، اس حیثیت سے کوئی شبہہ نہیں کہ یہ کتاب بڑی قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے، غالبؔ کی مدح یا قدح میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے بہت بڑے حصہ کا عطر اور لب لباب اس کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے، اور چونکہ اس پر دیدہ ورانہ تبصرہ بھی ہے، اس لئے قاری ہر مصنف کے محاسن اور معائب سے واقف ہو جاتا ہے، تمام بحث و گفتگو کے بعد کتاب کے آخری حصہ پر لائق مصنف

نے اپنی جو ایک جامع رائے لکھی ہے، ہم حرف بحرف اس سے متفق ہیں، لکھتے ہیں:-

"مولانا حالی نے اپنی طبیعت کی سنجیدگی، نظر کی ژرف بینی، فکر کی گہرائی اور تنقید نگاری کی نکتہ پروری سے غالب کی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے میں جو اعتدال پسندی اور میانہ روی اختیار کی ہے، وہی غالب کی شاعری کے تنقیدی لٹریچر کا راس المال ہے، اس کے بعد جو کچھ لکھا گیا اس میں کچھ تو واقعی مفید اور قابل مطالعہ ہے، مگر بہت کچھ یا تو تفریحی ہے، یا تنقید نگاری کی ذہنی مشق اور ورزش"

(مئی ۱۹۷۹ء)

ان دونوں تبصروں کو پڑھ کر راقم نے مولانائے محترم کو ایک خط لکھ کر اُن سے پوچھا کہ انھوں نے ان دونوں جلدوں پر جو تبصرہ کیا ہے، کیا یہ رسالہ کے ایک اڈیٹر کی حیثیت سے ایک رسمی فرض انجام دینے کے سلسلہ میں ہے، یا یہ تحریریں اس محبت کی بنا پر لکھ دی گئی ہیں، جس کی کچھ بوندیں اس کے عاجز مصنف کے لئے اُن کے دل میں ٹپکتی رہتی ہیں؛ اس کے جواب میں اُن کا یہ نجی مکتوب ملا،

علی گڑھ - یکم جولائی ۷۹ء

محب محترم و مکرم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ،

والا نامہ پہنچا، شکریہ! میرے دل میں بقول آپ کے آپ کی محبت کی ایک بوند نہیں، بلکہ یقین مانئے ایک دریا موجزن ہے، لیکن تبصرہ نگاری کا فرض بڑا بے رحم ہے، وہ دوست اور دشمن میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا، اس لئے میں نے جو کچھ



لکھا ہے، اُس میں آپ کی محبت اور آپ کے ساتھ غیر معمولی تعلق خاطر کا دخل نہیں ہے، بلکہ میں نے محض اس لئے لکھا ہے کہ میں نے آپ کی کتاب مزہ لے لے کر از اول تا آخر پڑھی ہے، اور میں واقعی اس سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ آپ کے خیالات و افکار خود میرے اپنے خیالات و افکار کا عکس نظر آتے ہیں، میں بہت مشغول آدمی ہوں، اور پھر تبصروں میں قل و دل کا خیال رکھتا ہوں، ورنہ درحقیقت آپ کی کتاب اس کی مستحق تھی کہ اس پر پانچ چھ صفحات میں تبصرہ کرتا، اور ادب کی جو پھول جھڑیاں آپ نے چھوڑی ہیں، اُن سے لطف اندوزی میں اپنے ساتھ قارئین برہان کو بھی شریک کرتا، اللہ آپ کو خوش و خرم رکھے، آپ نے شبلی اور حالی کے اسکول سے تعلق رکھنے والے ہم لوگوں کی خوب ترجمانی کردی

ع: ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند،

والسلام

سعید احمد اکبرآبادی،

---

# مطبوعات جدیدہ

اسلام اور عصر حاضر: مرتبہ مولانا سمیع الحق صاحب تقطیع متوسط کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۴۶۴ مجلد قیمت: ۲۷ روپے، پتہ:- موتمر المصنفین دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور) پاکستان،

گذشتہ مہینہ ان صفحات میں موتمر المصنفین کی پہلی کتاب کا ذکر آچکا ہے، یہ اس کی دوسری کتاب ہے، جو سترہ ابواب پر مشتمل اور مولانا سمیع الحق مدیر الحق کے ان اداریوں کا مجموعہ ہے جو موجودہ مسائل اور تحریروں کے متعلق گذشتہ دس پندرہ برس کے اندر وقتاً فوقتاً ماہنامہ الحق میں شائع ہوئے تھے، دراصل مغربی تہذیب نے اخلاق و روحانیت کی بنیادیں متزلزل کر دی ہے دین کے بارے میں طرح طرح کے شبہات پیدا کر دیئے ہیں، اس کے اثر سے خود مسلمانوں کا تجدد پسند طبقہ شرعی احکام و عبادات کی غلط تعبیر کر رہا ہے اور اسلامی آئین، احکام، حدود و تعزیرات کو وحشیانہ قرار دے رہا ہے، اس کے نتیجہ میں مذہب سے بعد و بیگانگی اور نفرت و بدگمانی بڑھتی جا رہی ہے، اور تن آسان و سہولت پسند لوگ مذہبی قیود اور بندشوں سے آزاد ہوتے جا رہے ہیں، اس صورت حال سے پورا عالم اسلام دوچار ہے، اور پاکستان بھی اس کی زد میں ہے، اس کتاب میں مغربی تہذیب و تمدن کے ان بڑھتے ہوئے اثرات اور خطرناک نتائج کا جائزہ لیا گیا ہے، اور دینی حقائق و مسلمات میں تحریف، اسلامی عبادات و احکام



کی غلط تعبیر اور ان شرعی مسائل و قوانین سے انحراف کا جواب دیا گیا ہے جن کو خاص طور پر پاکستان میں تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے، جیسے زکوٰۃ، قربانی، حدود و تعزیرات، بے پردگی، خاندانی منصوبہ بندی، سود، تعدد ازدواج اور عائلی قوانین میں اصلاح و ترمیم وغیرہ، مصنف نے پاکستان کے مخصوص حالات کے تحت تجدد پسندوں، قادیانیوں، بہائیوں، منکرین حدیث اور بعض دوسرے فرقوں کی تردید کی ہے، اور جشن منانے کے مروجہ طریقوں کی خامیاں واضح کی ہیں، اس سلسلہ میں نزول قرآن اور میلاد النبی کا جشن منانے والوں کو کتاب و سنت سے وابستگی کی تلقین بھی کی ہے، اور بتایا ہے کہ جشن منانے کی اصل صورت یہی ہے، ایک باب میں دینی مدارس کے نظام و نصاب تعلیم میں اصلاح کی ضرورت اور علما کے خصوصیات و فرائض بیان کیئے ہیں، ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے دونوں حصوں کی علیحدگی اور اس سے پیدا ہونے والے بحران اور ۱۹۶۷ء کی عرب و اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست کے اسباب کا تجزیہ بھی کیا ہے، یہ اور اسی طرح کے متعدد وقتی اور ہنگامی مسائل پر اس کتاب میں بے لاگ تبصرہ کیا گیا ہے، اصولی حیثیت سے مصنف کا نقطۂ نظر صحیح ہے، لیکن خود ان ہی کے بقول "یہ وقتی مسائل پر ایک رسالہ کے اداریوں کا مجموعہ ہے، جس کی حیثیت مربوط و مستقل تصنیف کی نہیں ہے" اس لیئے اکثر تحریروں میں غصہ، جھنجھلاہٹ اور صحافتی رنگ پیدا ہو گیا ہے، اور جواب منطقی و علمی استدلال کے بجائے الزامی نوعیت کے ہو گئے ہیں، بعض اداریوں کی تازگی بھی باقی نہیں رہ گئی ہے، لیکن مجموعی حیثیت سے ان تحریروں کی اشاعت فائدہ سے خالی نہیں، مصنف کی اسلامی و دینی حمیت ہر مضمون سے ظاہر ہوتی ہے،

**آپ** مرتبہ جناب عرفان عباسی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۹۶، مجلد قیمت ۸ روپیے، پتہ (۱) اردو پبلشرز نظیر آباد لکھنؤ، (۲) اردو سماج ڈاکٹر موتی لال بوس روڈ، لکھنؤ،

یہ لکھنؤ کے سنہ ۱۹۳۵ء سے سنہ تک وفات پانے والے پچاس شعرا کا مختصر سوانحی خاکہ ہے، ان شاعروں میں اکثر کا وطن لکھنؤ تھا، مگر کئی ایسے بھی ہیں، جو اس کے قرب وجوار یا دوسرے مقامات کے رہنے والے تھے، مگر انھوں نے یا تو لکھنؤ ہی میں بودوباش اختیار کر لی تھی، یا عمر کا زیادہ حصہ وہیں بسر کیا تھا، اور لکھنؤ کے شعری ماحول اور ادبی فضا میں ان کی نشو نما ہوئی تھی، مولانا حسرت موہانی، اور ترقی پسندوں میں احتشام حسین، سجاد ظہیر، مجاز، اور بعض دوسرے شاعروں سے قطع نظر سب ہی شعرا لکھنؤ کے خاص رنگ سخن کے نمائندہ تھے، اس فہرست میں مسعود حسن رضوی، ادیب، مرزا محمد عسکری، مولانا عبد الماجد ناظر، نیاز فتحپوری، شوکت تھانوی، اور فرقت کاکوروی وغیرہ کے نام بھی ہیں، جن کی شہرت نثر نگار کی حیثیت سے زیادہ ہے، گو وہ شاعر بھی تھے، مصنف کو سبھی سے ملنے، قریب سے دیکھنے اور ان کا کلام سننے کا موقع ملتا تھا، اس لیے انھوں نے ان کا سراپا اس طرح بیان کیا ہے، کہ ان کی وضع قطع، شکل وصورت، سیرت واخلاق اہم واقعات وحالات اور شعری وادبی خصوصیات بڑی حد تک سامنے آگئی ہیں، کلام کا نمونہ اور تصویریں بھی دی گئی ہیں، شعراء کا یہ تعارفی سلسلہ قومی آواز لکھنؤ کے سنڈے اڈیشن کے لئے لکھا گیا تھا، اب اس کی کتابی صورت میں اشاعت ایک مفید ادبی خدمت ہے، اس سے ان شعرا پر آئندہ کام کرنے والوں کو مدد ملے گی زبان وبیان دلکش ہے، مگر بعض لفظوں کا املا غلط ہے، جیسے السلام علیکم کا اسلام وعلیکم، سبقت کا صبقت، تشبیہ کا تشبیح، اور نسب کا نصب وغیرہ،

جلد ۱۲۴ ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ اگست سنہ ۱۹۷۹ء عدد ۲

## مضامین



## مقالات



## باب التقریظ والانتقاد